ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں
طنز و مزاح

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں
طنز و مزاح

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

IBNE SAFI
KE JASOOSI NOVELON MEIN
TANZ-O-MIZAH

by

Dr. Manazir Ashiq Harganvi
Kohsar, Bhikanpur-3, Bhagalpur- 812001(Bihar)
Mob. : 09430966156

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-073-7
Price Rs. : 150/-

نام کتاب : ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح
مصنف : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
سنہ اشاعت : ۲۰۱۳ء
قیمت : ۱۵۰ روپے
مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی-۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

جاسوسی ادب کے رسیا
کرم فرما
مصطفیٰ کمال پاشا
کے نام

گفتنی

اردو ادب میں ابنِ صفی ایسا نام ہے جس نے کم پڑھے لکھے لوگوں کو اور بہت زیادہ پڑھی لکھی شخصیتوں کو متاثر کیا ہے۔

پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، ماسٹر، دکاندار یہاں تک کہ سبزی فروش کو بھی میں نے ابنِ صفی کا ناول پڑھتے دیکھا ہے۔

اردو کے بعض معروف شاعر اور کئی مجموعے کے خالق نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اردو لکھنا ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں سے سیکھا ہے۔

ایسی مشعل راہ تحریروں کو ادب کا درجہ کیوں نہیں ملا؟

کیا یہ فلاحی ادب نہیں ہے؟ اور تفریحی ادب؟

ہماری تنگ نظری کی وجہ؟

سچ تو یہ ہے کہ ابنِ صفی نے تھکے ہوئے ذہنوں کو آسودگی پہنچائی ہے، سماج کی کمزوریوں اور خرابیوں پر انگشت نمائی کی ہے اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ ان کی تحریریں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ تفریح مہیا کرتی ہیں اور زبان و بیان کو باوقار بناتی ہیں۔ ساتھ ہی قانون کا احترام کرنا سکھاتی ہیں۔ مزاح، رومان، تحیر، استعجاب، سنسنی خیزی، بھیانک واقعات او جرائم سے متعلق سچائیوں کو انہوں نے جس دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ دراصل وہ معاشرہ کی اصلاح کے قائل تھے۔

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

اپنے طرز کے واحد جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی کو ناقدوں نے نظر انداز کیوں کیا؟ جبکہ بیشتر ناقدوں نے اس مصنف کو پڑھا ہے۔

میرے خیال میں وجہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ لوگ سوچتے ہیں، جاسوسی کہانیوں سے جرائم کو بڑھاوا ملتا ہے۔ کسی حد تک اس کا احساس ابنِ صفی کو بھی تھا۔ انہوں نے خود اس نکتے پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''مجھے جاسوسی کہانیاں بہت پسند ہیں۔''

''تمہاری لائن کی چیز ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جاسوسی کہانیاں تباہ کن ہوتی ہیں۔''

''کیوں؟''

''ان سے جرائم پھیلتے ہیں''۔

''میں اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔ ہمارے یہاں کے زیادہ تر جرائم پیشہ لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ پچانوے فیصدی جاہل ہوتے ہیں۔ جرائم کی جڑیں دراصل مایوسی میں ملتی ہیں''۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''جس معاشرے کے افراد مستقبل کی طرف سے مایوس ہوجاتے ہیں، جرائم کی گرم بازاری بھی ہوجاتی ہے''۔

''تو کیا ہمارے معاشرے کی بنیاد مایوسی پر ہے۔''

''یقیناً ہے، مایوسی اور محرومی ان کے ذہنوں میں جڑیں پکڑ چکی ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔''

(گارڈ کا اغوا)

لیکن جاسوسی ادب کے سلسلے میں ناقدوں کی سوچ محدود ہونے کی یہ وجہ نہیں ہوسکتی۔ اور اگر کوئی وجہ ہے تو اس کی بھی جاسوسی ہونی چاہئے۔

ویسے اکیسویں صدی میں نظر انداز کرنے کا پہاڑ پگھلنے لگا ہے۔ اور دھوئیں

کا غبار چھٹنے لگا ہے۔ کئی مضامین لکھے گئے ہیں اور بعض رسائل گوشہ اور نمبر نکالنے کا اعلان کرچکے ہیں۔

ابنِ صفی کی جاسوسی سے متعلق میں نے بیشتر اہم مضامین جمع کئے ہیں۔ میری کتاب ''ابنِ صفی کا جاسوسی سنسار'' عنقریب منظر عام پر آرہی ہے۔

آج ضرورت ہے کہ ابنِ صفی پر کتابیں لکھی جائیں، پی ایچ ڈی کے لئے مقالے لکھے جائیں اور یونیورسٹی سطح پر ابنِ صفی کے ناول کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ سائنسی معلومات اور پیشن گوئی سے بھرپور ناولوں کو سلیبس میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب میں تنقید اور فکشن کا سرمایہ مغربی ادب کی مرہون منت ہے۔ پھر جاسوسی ادب کے سلسلے میں مغرب پر نگاہ کیوں نہیں جمتی؟ گارڈنر اور اگاتھا کرسٹی کے جاسوسی ناول امریکہ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ابنِ صفی کیوں نہیں؟

ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کے پلاٹ زمین سے جنم لیتے ہیں اور آس پاس کے معاشرے میں پنپتے ہیں۔ صوبائی عصبیت، فرقہ وارانہ منافرت اور دشمنوں کے فراڈ سے بچنے کا سلیقہ ان کے ناولوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔!

میں نے ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں سے ایک پہلو تراش کر طنز ومزاح میں بھی ان کی ذہانت، فطانت اور چبھن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابنِ صفی پر کتاب لکھنے کی تحریک مجسٹریٹ، شاعر اور غزل نما کے موجد شاہد جمیل نے دلائی۔ حق دوستی ادا کرتے ہوئے انہوں نے ابنِ صفی کے بعض ناول بھی مہیا کئے۔ ان ناولوں کو دوبارہ پڑھتے ہوئے طنز ومزاح والا پہلو سوجھ گیا۔ طالب علمی کے زمانے میں ابنِ صفی کو پڑھا تھا تب ہنس کر اور مسکرا کر رہ گیا تھا ـــــ آج اتنے برسوں بعد ان ناولوں کو پڑھتے وقت ذہن آسودہ اور سرشار ہے۔ اور کتاب لکھتے وقت نئے، انوکھے اور دلچسپ گوشے ذہن میں کھدبدا رہے ہیں اور مسرت آگیں لذت محسوس کر رہا ہوں۔

اردو کے سب سے بڑے ناشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے مالک جناب

مجتبیٰ خاں کا شکر گذار ہوں کہ ابنِ صفی پر میری دونوں کتابیں چھاپنے کے لئے وہ رضا مند ہوئے۔ جب میں نے انہیں فون پر اپنے پروجکٹ کے بارے میں بتایا، اس وقت وہ قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے، کہنے لگے ''بڑے اچھے موقع پر معاہدہ ہو رہا ہے۔ آپ ہمارے ادارے سے جڑے ہوئے ہیں، مسودہ بھیجئے''۔

کتاب ''ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح'' آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پذیرائی ملے گی، اس کا یقین ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

کوہسار، بھیکن پور۳، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)

☆☆

ابنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد اور قلمی نام ابنِ صفی ہے۔ وہ ۲۶ر جولائی ۱۹۲۸ء کو ایک چھوٹے سے گاؤں نارہ میں پیدا ہوئے تھے جو الٰہ آباد سے قریب ہے۔ ان کا انتقال کراچی میں ۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء کو ہوا۔ یہ رمضان المبارک کی ۱۲ر تاریخ تھی۔ کراچی کے پاپوش نگر قبرستان میں دفن ہوئے۔

جرائم اور خباثت کی تحقیق اور سراغرسانی اہلِ فن کے نزدیک عظیم ادب نہیں ہے۔ اردو میں سرّی ادب کو سبھی نے پڑھا ہے لیکن ناقدوں نے اس پر لکھنے میں کوتاہی برتی ہے۔ ابنِ صفی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے سچ کہا ہے کہ اسرار وسراغ رسانی اور تجسس کی کہانیاں مغرب کے کئی بڑے ادیبوں نے لکھی ہیں۔ سر آرتھر کانن ڈائل، ایڈگر ایلن پو سے لے کر جسٹرٹن تک۔ ہمارے ہاں ادبی پنڈت جاسوسی ادب کو ادب کی دنیا سے نکال دینے کے قائل ہیں۔ یہ درست ہے کہ کردار نویسی کے اعلیٰ معیار اور موضوع کی سنجیدگی کے بغیر جاسوسی ناول محض پیچیدہ اور تحیر افزا پلاٹ کی بنا پر ادب کی بارگاہ میں جگہ نہیں پا سکتا۔ مگر اچھا لکھنے والا جاسوسی ناول میں بھی انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں سفر کرتا ہے۔ ابنِ صفی کے ہاں صرف اس بات کی اہمیت نہیں کہ ''آگے کیا ہوگا''۔ ان کے ہاں ہمیں فریدی، حمید، قاسم، عمران، جوزف، سلیمان، روشی، جولیانا کی رفاقت میں اچھا وقت گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ Gassei جیسے بڑے فلسفی اور ادب شناس نے اسے ناول کی اصل اساس قرار دیا ہے۔

ابوالخیر کشفی اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں:

''کوئی پوچھتا کہ ابنِ صفی کو کیوں پڑھتے ہو تو میں پوری قوت سے جواب
دیتا کہ ابنِ صفی آپ کی بستی کے عظیم ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتا ہے۔
ان دنوں محمد حسن عسکری صاحب نثر کے مٹتے ہوئے فن پر آزردہ تھے۔ میں
نے انہیں ابنِ صفی کی دو تین ناولز پڑھنے کو دیں۔ اور پھر تو معاملہ یہ ہوا کہ وہ
ہر مہینے پوچھتے ''خیر صاحب، نیا ناول آیا؟''۔ جن لوگوں کو میں نے مشرف
با ابنِ صفی کیا ان میں سرشار صدیقی بھی شامل ہیں۔''

حالیہ برسوں میں جاسوسی ناولوں اور کہانیوں پر خصوصی توجہ دی جانے لگی ہے۔
خصوصاً ابنِ صفی کے حوالے سے مضامین لکھے جا رہے ہیں، بعض رسائل نے خصوصی نمبر نکال
کر ابنِ صفی کی ذہانت کا اعتراف کیا ہے۔

اگر دیکھیں تو اردو داستانوں میں سراغرسانی اور تجسس کے عناصر مل جاتے ہیں۔
بعض ابتدائی ناول میں بھی برائیوں کی بیخ کنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''ہنوز طلسم ہوشربا کے خیال سے دامن چھوٹ نہیں سکا۔ تہہ میں وہی روایتی
تخیل اور کسی قدر مافوق الفطرت باتوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ غور کرنے
سے طلسم ہوشربا اور آج کے جاسوسی ناولوں میں ایک گونا مماثلت ملتی ہے۔
جیسے اس میں خیر و شر کی لڑائی میں قلت کثرت پر فتح پاتی ہے ویسا ہی آج
جاسوسی ناولوں میں نیک و بد کی لڑائی نظر آئے گی۔ جیسے اُس زمانے میں
امیر حمزہ کے ساتھ عمرو عیار کا جزو لاینفک ہو گیا تھا ویسے ہی آج بھی خفیہ
پولیس آفیسر کے ساتھ ایک ہمزاد نظر آتا ہے، جیسے جاسوسی ناول میں فریدی
کے ساتھ حمید سائے کی طرح ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔''

اردو میں جاسوسی ناول کی ابتدا فیروز دین مراد سے ہوتی ہے۔ وہ مسلم یونیورسٹی،
علی گڑھ کے کمسٹری ڈپارٹمنٹ میں لیکچرر تھے۔ لیکن اردو زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔
انہوں نے شرلاک ہومز کے ترجمے کو فوقیت دی اور ''حکایات شرلک ہومز'' اور ''خوں نابہ عشق''

کے نام سے دو کتابیں شائع کرائیں۔ شرلاک ہومز سیریز کے پہلے ناول ''اے اسٹڈی اِن
اسکارلٹ'' کا ترجمہ ''خوں نابہ عشق'' ہے۔ کانن ڈائل کے شرلاک ہومز نے کئی ممالک کے
محکمہ سراغرسانی کو متاثر کیا تھا۔ ان میں انگلستان، فرانس اور امریکہ اہم ہیں۔

فیروز دین مراد کے ہمعصر ظفر عمر تھے۔ انہوں نے فرانسیسی جاسوسی افسانوں کو اپنایا
اور اردو میں بہرام کے کردار کو اس طرح پیش کیا کہ طبع زاد معلوم ہو۔ حالانکہ مارس لبیلانک
کے کردار آرسین لوپن سے بہرام نے جنم لیا تھا۔ ''نیلی چھتری'' کا ترجمہ بیحد پسند کیا گیا۔

جاسوسی ناولوں کے ترجمہ نگاروں میں تیرتھ رام فیروز پوری اور خان محبوب طرزی
کے نام بھی اہم ہیں کہ انہوں نے رائیڈر ہیگرڈ اور رینالڈ کے ترجمے اردو کو دیئے اور ایک
خاص ذوق کے پڑھنے والوں تک جاسوسی ناول پرونے کا کام کیا۔ مرزا ہادی رسوا، ندیم
صہبائی اور پنڈت ملک راج شرما آنند نے بھی ترجمے کئے۔

۱۹۵۰ء سے قبل اردو میں جاسوسی ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا حامد بیگ
رقمطراز ہیں:

''ابنِ صفی سے قبل طبع زاد جاسوسی ناول لکھنے والوں میں پنڈت کشور چند
مصنف ''رتن بے بہا'' پانچ جلدوں میں، ''پیاری'' دو جلدوں میں، ''جام
دلربا''، ''بدرالنساء بیگم''، ''پلیڈر کی کرتوت''، ''پدماوتی'' وغیرہ (طابع لالہ
دیوی داس جانکی داس تاجران کتب، بازار مائی سیواں۔ امرتسر)۔
طالب لکھنوی مصنفہ ''ایران کا چاند'' اور ''نولکھا بازار'' (اپریل ۱۹۴۹ء)،
فدا علی خنجر ''خونی ٹولہ'' نور محمد عشرت ''خونی بہرام'' احمد اللہ خاں ''خونی
ہتھکڑی'' اور غالب الہ آبادی ''خونی پہچان'' ۱۹۴۹ء نے بہت شہرت
پائی۔''

جہاں تک تراجم کا معاملہ ہے، مرزا ہادی رسوا کے ترجموں سے متعلق ڈاکٹر ظہیر فتح
پوری لکھتے ہیں:

''رسوا ایک کامیاب مترجم تھے۔ اور ان کے سب سے بہتر نمونے وہ تراجم

ہیں جو انہوں نے دارالترجمہ، حیدرآباد (دکن) میں کیے۔ اس کے برخلاف
متذکرہ بالا ناولوں میں بیشتر مقامات پر ترجمے کا معیار بہت ہلکا ہے۔ یہ
سب معمولی درجے کے انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم ہیں جن کی کوئی
ادبی حیثیت نہیں۔"

مرزا رسوا نے میری کوریلی کے ناول Worwood کو "خونی عاشق" کے نام سے
ترجمہ کرتے وقت اکثر فرانسیسی اشعار کی جگہ پوربی گیت شامل کردیئے ہیں اور بغیر کسی جواز
کے کچھ حصے حذف بھی کردیئے ہیں مثلاً اصل ناول کے باب ۱۴ اور ۱۵ کو حذف کرکے ۱۳ کے
بعد باب ۱۶ شروع کردیا ہے۔

ان سب کے بعد ۱۹۵۲ء میں "دلیر مجرم" لے کر ابنِ صفی سامنے آتے ہیں۔ جن
کے خلاقانہ ذہن اور اختراعی کردار کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ بعد میں بہت سے پھوہڑ
نقال سامنے آئے جن کی فکری صلاحیت ہر لحاظ سے پست ہے۔

ابنِ صفی نے جاسوسی ادب کو مستقل فن بنایا اور تنوع کے ساتھ اپنی انفرادیت
برقرار رکھی ہے۔

میں اردو کے ثقہ ادیب و ناقد مجنوں گورکھپوری کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں کہ
ابنِ صفی کے بیشتر ناول میرے مطالعے سے ایک سے زائد بار گذر چکے ہیں۔ اور میں نے
اپنے طور پر ان کو دو خانوں میں رکھا ہے۔ ایک تو وہ جن میں روزمرہ کے جرائم اپنی تمام نئی
پیچیدگیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اور سراغرسانوں کا مخصوص گروہ ان کو بے نقاب
کرنے اور متعلق مجرموں کو ٹھکانے لگانے میں بالآخر کامیاب ہوتا ہے — ان ناولوں کی
دوسری قسم وہ ہے جن میں مجرم یا مجرموں کا ایک مخصوص گرگا موجودہ سائنسی دنیا کے جدید ترین
آلات اور ذرائع سے کام لیتا ہے اور سراغرسانوں کی زندگی بھی خطرے اور ہلاکت میں
پڑ جاتی ہے۔ فریدی اور عمران کے سلسلوں کے تمام ناول ان ہی دو قسموں میں آتے ہیں۔
ابنِ صفی تخیل اور محنت دونوں سے کام لے کر اپنے پڑھنے والوں میں سراغرسانی اور سائنسی
اکتسابات دونوں کی عملی واقعیت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ سراغرساں کے لئے پہلی بات جو

اساسی حیثیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ اس کو ایک خاص ذہنی ساخت کا آدمی ہونا چاہئے اور شروع
سے آخر تک تمام خارجی اسباب و ذرائع کے جیسا ہونے کے باوجود اس ذہنی ساخت کو نمایاں
اور غالب رہنا چاہئے۔ فریدی، حمید، عمران اور کسی حد تک انور کے اندر وہ خصوصیت موجود
ہے جو کسی کو سراغرساں بنا سکتی ہے — فریدی کے کارناموں اور ان میں اس انہماک کے
ساتھ تمام ادنیٰ سے اعلیٰ منازل کو طے کرنے کے لئے وہ اپنی جیب سے جتنا خرچ کرتا ہے وہ
ایک داستانی دولت Fabulus Walt کا متقاضی ہے جو اس دور میں بڑے بڑے جاگیردار
یا سرمایہ دار کو میسر نہیں۔ مگر اس کو ہم ایک تخیلی تصور Ideal Concept کے طور پر قبول
کر سکتے ہیں۔ عورت سے بدکتے رہنا یا اس سے ہر موقع پر بدگمان یا برگشتہ رہنا، اس کو ہم
ایک جنسی گریز کے طور پر برداشت کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی نفسیاتی گرہ سے متعلق ہوتا ہے۔
ممکن ہے یہ حمید کی اس تفریح کا جواب ہو جو بغیر کسی عورت کے حمید کے لئے ممکن نہیں ہے۔
حمید سراغرسانی کی تمام صلاحیتیں رکھتا ہے اور بڑے کام کا آدمی ہے۔ حمید کے ساتھ ذہن معاً
قاسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ابنِ صفی کے تمام کردار اچھوتے تو ہوتے ہی ہیں، قاسم بھی
ایک اچھوتا کردار ہے اور اس کی حرکتیں بہت بڑی حد تک تفریح کا اچھا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔
حمید کی شرارتوں سے بار بار زک کھا کر قاسم کی حمید کے ساتھ دوستی یقیناً قابلِ تحسین بات ہے۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں ایک اطمینان بخش خصوصیت یہ ہے کہ ان میں زبان کا
معیار قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان ایسے معیار کی ہوتی ہے جو تعلیم یافتہ طبقے میں بھی
قبول اور پسند کی جائے۔ ان کی زبان میں ادبی چاشنی ہوتی ہے اور محاوروں کا لطف بھی ہوتا
ہے جو گہرائی اور دلکشی کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

ابنِ صفی نے لکھنا کیسے شروع کیا، اس کے بارے میں انہوں نے خود روشنی ڈالی
ہے۔ اس سے ان کی زبان دانی اور خاندانی حالات کا بھی علم ہو جاتا ہے:

"سورج غروب ہوتے ہی سالخوردہ محرابوں میں ابابیلیں بسیرا لینے لگتیں
اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب باغ سیب میں افراسیاب کی محفل سجے گی
اور چالاک بن عمرو، ملکۂ حیرت کی کسی کنیز کے بھیس میں اسی کی سواری کے

ہمراہ اس محفل میں در آئے گا۔

میں گھنٹوں طلسم ہوشربا کے کرداروں کے بارے میں سوچتا رہتا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں طلسم ہوشربا کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالی تھیں اور خواجہ عمرو کے شاگردوں میں مہتر برق فرنگی میرا پسندیدہ کردار تھا۔ اور میری خواہش تھی کاش چالاک بن عمرو کی بجائے برق فرنگی ملکہ حیرت پر عاشق ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں چالاک بن عمرو مجھے کچھ مولوی مولوی سا لگتا تھا۔ اور اسی سات آٹھ سال کی عمر میں یہ بھی سوچتا تھا کاش ملکہ براق شمشیر زن شہزادہ ایرج کی بجائے مجھ پر عاشق ہو جاتی۔

وہ ایک بھرا پرا قصبہ تھا جہاں میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ خوشحال زمینداروں کی بستی تھی۔ ہر طرف فرصت نظر آتی۔ تاش، شطرنج اور گنجفے کی بازیاں جمتیں۔ کچھ لوگ سیر و شکار سے جی بہلاتے۔ بعض گھرانے ایسے بھی تھے جہاں زیادہ تر علم و ادب کے چرچے رہتے۔

والد مغفور کو مطالعے سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا گھر میں ناولوں اور قدیم داستانوں کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ لیکن مجھے اجازت نہیں تھی کہ ان کو ہاتھ بھی لگاؤں۔ بس چوری چھپے کوئی کتاب کھسکائی اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ باہر کھیلنے جا رہا ہوں، چھت پر ہولیا۔

سارا سارا دن گزر جاتا۔ آخر ایک دن پکڑا گیا اور والدین میں ٹھن گئی۔ لیکن فیصلہ میرے ہی حق میں ہوا۔ والدہ نے کہا "ان بچوں سے تو بہتر ہی ہے جو دن بھر گلی میں گلی ڈنڈا یا گولیاں کھیلتے پھرتے ہیں۔"

پھر اس دن سے کوئی روک ٹوک نہ رہی اور میں داستانوں میں ڈوبا رہا۔

پرائمری تعلیم قصبے کے اسکول میں مکمل کرنے کے بعد سکنڈری تعلیم کے لئے شہر جانا پڑا۔

عموماً ہوتا یہ تھا کہ زمینداروں کے بچے اردو مڈل پاس کر کے بیٹھ رہتے تھے۔ اس رویے کے پیچھے درحقیقت یہ ذہنیت کارفرما تھی کہ ہمارے بچے کو نوکری تھوڑا ہی کرنا ہے جو بی اے، ایم اے کرائیں۔ لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ بچے کو نوکری کرنی ہو یا نہ کرنی ہو، ہر حال میں اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔

بہر حال شہر آئے۔ کچھ دنوں کے لئے مطالعے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کتابوں کے ڈھیر گاؤں ہی میں رہ گئے۔ اسکول سے واپس آ کر بڑی الجھن میں مبتلا رہتا۔ پھر ہوائی قلعے بننے لگتے۔ اور خود کو طلسم ہوشربا کی حدود میں پاتا۔ کسی مظلوم جادوگرنی کے لئے کوئی کارنامہ سرانجام دے کر اس کی آنکھوں کا تارا بنتا اور اس کی مدد سے پورا مطبع و کتب خانہ منشی نول کشور کا اٹھوا منگاتا۔ دن گزرتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ شہر تو بڑی واہیات جگہ ہوتی ہے جہاں ڈھیروں پیسے نہ ہوں تو آدمی مطالعے کو بھی ترس جائے۔

ایک دن ایک ہم جماعت کے گھر دو کتابیں نظر آئیں۔ ایک کا نام "عذرا" تھا اور دوسری کا نام "عذرا کی واپسی" (غالباً عنایت اللہ یا کسی دوسرے بزرگ کا ترجمہ)۔ کسی نہ کسی طرح وہ جلدیں وہیں بیٹھ کر پڑھ ڈالیں اور بالکل ہی نئے قسم کے خوابوں میں ڈوب گیا۔ اب مجھے عذرا ملتی اور بڑے غور سے دیکھتی ہوئی نام پوچھتی۔ میں کہتا، خاکسار کو اسرار احمد ناروی کہتے ہیں۔ ٹھنڈی سانس لیتی اور بہت دردناک لہجے میں کہتی "نہیں تم قلقراطیس ہو۔ میرے محبوب۔ اب سے ہزاروں سال پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ میں غیر فانی تھی۔ تم مر گئے تھے۔ تم نے پتہ نہیں کہاں کہاں کتنے جنم لئے۔ اور میں تمہاری تلاش میں سرگرداں رہی۔ اب الٰہ آباد میں ملے ہو۔ کیا عمر ہے تمہاری؟"۔

"دس سال"۔ میں جواب دیتا۔

"خیر"۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی "میں دس سال اور انتظار کر لوں گی"۔

اس طرح رائیڈر ہیگرڈ نے میرے کچے ذہن پر تسلط جمایا۔ طلسم ہوشربا اور رائیڈر ہیگرڈ کے تاثرات نے آپس میں گڈمڈ ہو کر میرے لئے ایک عجیب سی ذہنی فضا مہیا کر دی تھی جس میں ہمہ وقت ڈوبا رہتا۔ ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس۔ خوابوں اور مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔

پھر ایک دن میں نے بھی ایک کہانی لکھ ڈالی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یہ افسانہ میں نے ہفت روزہ "شاہد" بمبئی میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ جناب عادل رشید اس جریدے کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے مجھے کوئی معمر آدمی

سمجھ کر کچھ اس طرح میرا نام کہانی کے ساتھ شائع کیا تھا:

''نتیجۂ فکر مصورِ جذبات حضرت اسرار ناروی''۔

کہانی چھپتے ہی میری شامت آگئی۔ گھر کے بڑوں نے کچھ اس انداز میں مخاطب کرنا شروع کر دیا:

''ابے او مصور جذبات، ذرا ایک گلاس پانی لانا''۔

وقتاً فوقتاً شاہد ویکلی میں کہانیاں چھپتی رہیں۔ زیادہ تر رومانی کہانیاں ہوتیں۔

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے شاعری کا چسکا بھی لگ گیا۔

ان دنوں ''ترقی پسندی'' کا بڑا زور تھا۔ کسی شاعر کا تعارف کراتے وقت لوگ یہ ضرور کہتے کہ جناب ترقی پسند شاعر ہیں۔ اور جس سے تعارف کرایا جاتا وہ سمجھ لیتا کہ ان کی شاعری طبلے سارنگی کے لئے بالکل بیکار ہوگی۔ ان دنوں عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بات کہہ دینا ہی ترقی پسندی ہے۔ جگر اور جوش کے رسیا آزاد نظم لکھنے والوں کو ترقی پسند شاعر سمجھتے۔ ہر چند کہ میں نے آزاد شاعری نہیں کی لیکن خواہش ہوتی تھی کہ میرا تعارف بھی ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے کرایا جائے۔

اور پھر یہ بات تو بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آئی کہ میں اس وقت بھی ترقی پسند ہی تھا جب آزاد نظم میری مشکل پسند طبیعت سے لگا نہیں کھاتی تھی کیونکہ بعد کی بحثوں نے ایک مخصوص نصب العین رکھنے والوں کو ترقی پسند قرار دیا تھا اور بقیہ لوگ صرف جدت پسندی تک محدود کر دیئے گئے تھے۔ پھر ان دنوں گروپوں میں بھی مزید گروہ بندیاں ہوئیں اور ''اپنی ڈفلی اپنا راگ'' والا رجحان تیزی سے پھیلنے لگا۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت میں بی اے کے پہلے سال کا متعلم تھا۔ اس دور کے ذہنی بھونچال نے کافی عرصے تک پراگندگی اور انتشار میں مبتلا رکھا۔

خوابوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ''افراسیاب'' نے پورے معاشرے میں جادو کی چھریاں برسائی ہوں۔ جیسے کوئی ''ہیا'' جوانی برقرار رکھنے کی ہوس میں غسل آتشیں کر کے جھلس گئی ہو۔ جیسے قدیم قلقراطیس کا تابوت سنگسار کر دیا گیا ہو اور نفرستان

میں اب کبھی محبت سر نہ اٹھا سکے گی۔

۱۹۴۸ء کے اواخر تک ذہن کا تخلیقی گوشہ ویران ویران سا رہا۔۔۔ پھر اچانک بعض دوستوں کی تحریک پر وہ برف پگھلی اور میں نے ماہنامہ ''نکہت'' الہ آباد کے لئے طنزیات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طغرل فرغان کے نام سے متعدد طنزیہ مضامین اور افسانے لکھے۔ کچھ پیروڈیز بھی لکھیں۔ لیکن میں اس سے مطمئن نہیں تھا۔ کچھ اور کرنا چاہیئے۔

جاسوسی ناولوں کا سلسلہ ۵۲ء میں شروع کیا تھا۔ اس کی تحریک ایک مباحثے سے ہوئی۔ ایک بزرگ کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی مارکیٹ بنا سکتی ہیں۔ (ان دنوں سچ مچ اردو میں ایسی کہانیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا)۔ میں ان بزرگ سے اتفاق نہ کر سکا۔ میرا خیال تھا کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔

''کچھ اور بھی کرنا چاہیئے''۔ کا مطالبہ بالآخر پورا ہو گیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک جاسوسی ماہنامے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اور میں اس کے لئے ہر ماہ ایک مکمل ناول لکھنے لگا۔

اس سے قبل اردو میں صرف منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم پائے جاتے تھے یا دو تین ناول ظفر عمر کے۔ وہ بھی ان کے اپنے نہیں تھے بلکہ مارس لیبلانک کے چند ناولوں کو مشرف بہ اسلام کر ڈالا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لہٰذا بعض تذکرہ نویس آج بھی ''نیلی چھتری'' اور ''لال کٹھور'' وغیرہ کو اوریجنل سمجھ کر اسی انداز میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

بہر حال 'جاسوسی ناول' میرے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ لہٰذا پہلی بار مجھے بھی انگریزی ہی کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ میرا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' ڈاکٹر گن کے ناول ''آئرن سائیڈز لون ہینڈ'' سے ماخوذ تھا۔ فریدی اور حمید کے کردار میری اپنی اپج تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنے طور پر لکھنا شروع کیا۔ لیکن حتی الامکان باہر کی آلودگیوں سے دامن بچانے کے باوجود بھی میرے آٹھ ناول کلی طور پر میرے اپنے نہیں تھے۔ یا تو ان کے پلاٹ انگریزی سے لئے گئے ہیں یا ایک آدھ کردار باہر سے آئے ہیں۔

غالباً اپنے ناول ''زمین کے بادل'' کے پہلے ایڈیشن میں، میں نے ان آٹھ ناولوں کی تفصیل دی تھی۔

جی ہاں! ڈیڑھ سو سے زاید ناولوں میں سے صرف آٹھ ناول ''ملاوٹ'' والے ہیں اور بقیہ سب میرے اپنے۔

''بڑا تیر مارا ہے آپ نے ابنِ صفی صاحب! کچھ ادب کی بھی خدمت کیجئے''۔ یہ میرا اپنا خیال نہیں بلکہ بعض احباب کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے مقصدی ادب پیش کرنا چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ تفریح بجائے خود ایک مقصد ہے۔ تھکے ہوئے ذہنوں کے لئے تھوڑی سی تفریح مہیا کر دینا۔ اگر کسی کے بس میں ہو تو اسے بھی ایک مقدس فریضہ سمجھنا چاہئے۔ اس سے قطع نظر بھی.......... میری کہانیاں مقصدی ہی ہوتی ہیں۔ کچھ احمق اس سلسلے میں فراری ذہنیت وغیرہ کی بات کرنے لگتے ہیں۔ انہیں شاید نہیں معلوم کہ ''فرار'' ہی بنیادی طور پر مزید تعمیر کا باعث بنتا ہے۔ یکسانیت سے فرار انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج آدمی بھی خرگوش اور گیدڑ کی سی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ بتایئے اگر کوئی مثال ملتی ہو کہ گیدڑوں اور خرگوشوں نے بھیڑیوں کے خلاف مورچہ لگایا ہو۔ یہ آدمی ہی ہے جو مظلومانہ ذہنیت سے فرار کر کے استبداد کے آگے ڈٹ جاتا ہے۔ یکسانی سے فرار ہی آدمی کو اس ایٹمی دور تک لایا ہے۔

مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں — ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریقہ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتیں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے۔ اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے؟

افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح فٹ بال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں

بہل سکتا اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کے لئے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے۔ تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لئے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔

بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں۔ عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا اس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کر دیا ''یہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ بہت برا ہوا'' — لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمہارے گیت دیوانگی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے؟

میں سوچتا...... سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لئے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کے لئے تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انہیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے۔ جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لئے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے''۔

ابنِ صفی کی تخلیقی سوچ سائنس کی حقیقت رکھتی ہے۔ ان کی دانشوری میں تخلیق کاری کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں طنز و مزاح نگاری بھی ہے۔ انہوں نے کئی نام سے طنزیہ و مزاحیہ افسانے اور مضامین لکھے۔ میں اِس کتاب میں ان کے ایسے شہہ پاروں پر روشنی نہیں ڈال رہا ہوں بلکہ ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح کی جو چاشنی اور پھلجھڑیاں ہیں ان کا جائزہ لے رہا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے طنز و مزاح پر اور اردو میں طنز و مزاح نگاری پر مختصراً روشنی ڈالنا

مناسب سمجھتا ہوں۔

طنز کو انگریزی میں Satire کہتے ہیں، سٹائر کا مفہوم بہت حد تک طنز یا طنزیات سے ہم آہنگ ہے۔ ویسے سٹائر کے لئے اردو میں طنز کے علاوہ ہجو، ہزل، پھبتی، نوک جھونک، فحاشی، پھکڑ، ٹھٹھول، لعن طعن، استہزا، سب و شتم، ہجو ملیح، مذمت، مضحکانت، تعریض، تنقیص وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن طنز میں جو وسعت مضمر ہے وہ دوسرے الفاظ میں نہیں ہے۔

Step Hen Leacock نے طنز میں چار خصوصیات کو ضروری قرار دیا ہے:

First They are all concerned with follies, on frailties of one kind or a another. Second there is in each a strong element of humour. Third they express on imply some form of criticism. Fourth they all have an effection and pleasing literary form.

(English satire by J.L. Small. Page : 12)

جے ایل اسمیل نے طنز کی اہمیت کو مثال دے کر سمجھایا ہے:

Every satirist is a self appointed counsel for the prosecution. The plaintiff for whom he acts is some times society. Very often himself and the defandant against whom he brings his case is usually some man or women; or group of men and women, guilty he claims of follies or absurdites.

(English satire parody and Barlesque, Page:33)

وقار عظیم کہتے ہیں:

''طنز جذبات کے اظہار کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں جذباتی انسان جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے سطحی محرکات سے بچتا ہوا کسی ایسی بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی آواز میں پیمبرانہ شان پیدا ہو جاتی ہے

اور کسی کی کہی ہوئی بات میں یہ پیمبرانہ شان صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب بات کی بنیاد گہرے جذبے اور احساس پر ہو۔''

(ماہنامہ ''ساقی'' دہلی۔ ظرافت نمبر۔ صفحہ ۱۶)

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں:

''طنز کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مزاج کے برعکس اس میں نشتریت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ نشانہ تمسخر کی طرف طنز نگار کے ردِ عمل میں ایک استہزائی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اور وہ در حقیقت جس چیز یا عیب کا مذاق اُڑاتا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے''۔

(ماہنامہ ''نقوش'' لاہور، طنز و ظرافت نمبر، جنوری فروری ۱۹۵۹ء، صفحہ ۵۱)

طنز کا مقصد تخریبی نہیں ہوتا بلکہ اصلاحی ہوتا ہے۔ وہ عیبوں اور خطاؤں کی طرف لطیف لیکن تیر و نشتر سے تیز اشارے اس لئے کرتی ہے کہ ان سے شخصی عیب ہنر بن جائیں۔ طنز نگار ایک سماجی مصلح ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ان نقائص اور عیوب کو دیکھتا ہے جو روز بہ روز سماج میں جڑ پکڑتے جاتے ہیں۔ جب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے تو جذبۂ نفرت جوش میں آتا ہے اور وہ ان نقائص کی طرف اشارے کر کے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

''آکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' میں طنز کی تعریف یوں درج ہے کہ ''یہ شعری یا نثری وہ تخلیق ہے جس میں روز مرہ کی کمزوریوں یا بے وقوفیوں کا کبھی کبھی کچھ حقیقتوں کے ساتھ مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی فرد خاص یا افراد کے گروہوں کا مضحکہ اُڑانا ہوتا ہے''۔

(Oxford English Dictionary Vol. 11, Page 119)

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''جو چیز طنز کے سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ طنز اور حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت کا ادراک کئے بغیر طنز پیدا بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصور نہیں ہے تو وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو کو

ہی نہیں سمجھ سکتا"۔ (نیرنگ نظر، مرتبہ ابن فرید، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۵۶)

بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حسن دونوں ضروری ہیں۔ خالص ظرافت تشیب وفراز کا احساس دلا کر ایک مسرت یا انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی ہے۔ اسلوب کی طرح طنز وظرافت کا حسن بھی یہی ہے کہ اس کے غازہ ورنگ پر نظر نہ پڑے۔ یعنی تلوار کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے"۔ (تنقید کیا ہے۔ ۱۹۶۴ء، صفحہ ۵۳)

مزاح کو انگریزی میں Wit کہتے ہیں۔ اس کی مقصدیت کی تعریف Beattle ان الفاظ میں کرتا ہے:

This leads me to refer to these refinements in wit and humour which take place in society as menking improves in polite behavior.

(The Springs of Laughter- by C.W. Kimmins- Page:23)

ایڈیسن نے مزاح نگار کو 'خدائے ظرافت' کہا ہے:

The God wit, who bore several quivers on his shoulders, and grasped several arrows in his hand, because there was something so amiable and yet so piereing in his looks, filled the beholder with have and terror.

(The springs of Laughter- Page: 24)

طنز ومزاح کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے۔ طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے نفرت کرتا ہے اور اسے تبدیل کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مزاح زندگی اور ماحول سے مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ طنز نگار توڑتا ہے اور

توڑنے کے دوران ایک قہقہہ لگاتا ہے۔ چنانچہ طنز میں جذبۂ افتخار کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود رہتا ہے اور دوسری طرف مزاح نگار اپنی ہنسی سے ٹوٹے ہوئے تار کو جوڑتا ہے اور بڑے پیار سے ناہمواریوں کو تھپکنے لگتا ہے۔" (اردو ادب میں طنز ومزاح، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۶۱)

اردو طنز ومزاح نگاری معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے بدلاؤ سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کی شدت، نشتریت اور زہرناکی سے افراد کی ذہنی زندگی اور ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اردو میں طنز ومزاح نگاری کی روایت پرانی ہے۔ سودا، مصحفی، انشاء، رنگین، جعفر زٹلی وغیرہ ایسے نام ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان سب کے یہاں مسخراپن، پھکڑپن، ابتذال، فحش نگاری، استہزا اور رکاکت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے عہد میں عیش پرستی، درباری رنگ رلیاں اور قوت عمل کی کمی کی وجہ سے اقتدار ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا، اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ بہت حد تک غالب کے خطوط نے بے ساختگی کو زندہ رکھا تھا اور اردو نثر میں طنز وظرافت سے دلچسپی اور لطف اندوزی کی نمائندگی کی تھی۔ نذیر احمد کے یہاں بھی طنزیہ ومزاحیہ اسلوب ملتا ہے۔ شاعری میں سودا پہلے طنز نگار ہیں جن کا سرمایہ ہجویہ کلام ہے۔

۱۸۷۸ء میں جب منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" کا اجرا کیا تو ان کے مقاصد میں تھا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی معاملات کی برخود غلط کو سامنے لائیں۔ اس کی داغ بیل نظیر اکبر آبادی ڈال چکے تھے۔ ان کی شگفتگی میں تلخی ملتی ہے۔ جس میں سلیقہ ہے اور تقابلی طنز کی بہترین مثال ہے۔ ان کی نشتر زنی سے آدمی نامہ سامنے آتا ہے اور زندگی کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ یہی سلیقگی، تلخی، زہرناکی اور نشتریت "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں کے یہاں ملتی ہے۔ سجاد حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، عبدالغفور شہباز، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق اور اکبر الہ آبادی وغیرہ نے طنز ومزاح نگاری میں بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ لیکن "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں کے یہاں ایک پہلو تخریبی تھا کہ سرسید کی تحریک

پر گندگی اچھالی گئی۔ ورنہ اس عہد کے طنز ومزاح نگاروں کے یہاں شوخی تھی، بے باکی تھی، اخلاقی بنیادوں پر پھیلتی سکڑتی رنگ آمیزی تھی، ندرت، تازگی اور جدت پسندی تھی۔ لیکن بعض کے یہاں چرب زبانی ملتی ہے اور ادبی چاشنی کی کمی کھٹکتی ہے۔ ''اودھ پنچ'' ۱۹۱۳ء میں بند ہوا۔ اس دوران اس نے ایک نئی فضا ضرور قائم کردی تھی۔ اس دور کے چند دیگر لکھنے والوں میں نواب سید محمد آزاد، اشرف علی فغاں، فضل حق آزاد، یگانہ چنگیزی وغیرہ نے ابتذال سے بچ کر اشعار کہے، انفرادی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا عنصر نمایاں رکھا، ''الپنچ، فتنہ اور عطر فتنہ'' سے ان کی وابستگی رہی، ریاض خیر آبادی کی شوخی بھی سامنے آئی۔ سلطان حیدر جوش، ''ہمدرد'' کے لکھنے والوں میں تھے۔ وہ ''جان بل'' کے نام سے فلسفیانہ طنز ومزاح کا رنگ و آہنگ پیدا کرتے رہے۔

ان سب کے بعد شگفتگی، بانکپن اور رعنائی لئے ہوئے طنز ومزاح کا وہ دور آیا جس میں فرحت اللہ بیگ، احمد شاہ بخاری پطرس، خواجہ حسن نظامی، محفوظ علی بدایونی، عبدالعزیز فلک پیما، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور ملا رموزی وغیرہ فنی محاسن اور زمانہ شناسی کے ساتھ سامنے آئے۔ قاضی عبدالغفار، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کے یہاں طنز ومزاح قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے جو تفکر کے رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ''طنزیات ومضحکات'' میں لکھا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی طنز میں تلخی اور زہرناکی کا عنصر غالب ہے۔ اور ان سب پر بقول سید سلیمان ندوی، مولویت طاری ہے۔ ان کو جماعت کے موجودہ اور مقررہ نظام میں عافیت اور جمعیت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ برخلاف اس کے ظفر علی خاں ہیں جن کے ہاں شدت ہے مگر زہرناکی کا گزر نہیں۔ ظفر علی خاں کی طنز میں عملاً قوت اور بیداری پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی طنز کو منوا بھی سکتے ہیں۔ ان کے یہاں بددعائیں اور عذاب الیم کی بشارتیں نہیں ملیں گی، وہ تپش کے قائل ہیں تپسیا کے نہیں۔ یہی کیفیت ابوالکلام کی ہے۔ لیکن ظفر علی خاں اور ابوالکلام جہاں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں وہ بھی نمایاں ہے۔ ابوالکلام کی مثال اس پہلوان کی ہے جو وسط میدان میں مبارز طلب ہو اور دوسروں کا نہیں

بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔ ظفر علی خاں صرف آرڈی نینس شکنی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ان کی رجز میں تھوڑا سا حسن طلب بھی ہوتا ہے اور یہ طلب ممکن ہے کبھی اپنے ہی اعوان و انصار سے ہو یا پھر غیر موجود یا غیبی طاقتوں سے۔ وہ دوسروں کو آمادہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اپنی آمادگی سے بحث نہیں کرتے۔ تیسری طرف قاضی عبدالغفار ہیں، ان کی طنز ایک حد تک ڈرائنگ روم کی طنز ہے۔ نہایت نازک، نہایت ستھری، نہایت حسین نیز چمکتی ہوئی جیسے کسی ماہر فن کے ہاتھ میں عمل جراحی کے لئے ایک نشتر ہو۔ ان کی طنز ایک طور پر کتابی ہے۔ پڑھئے اور انشا پرداز کو داد دے لیجئے۔ نہ ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کسی آمادگی کی حاجت۔ ان تمام خیالات کو اور مختصر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مولانا ماجد اصلاح سے مایوس ہیں۔ ابوالکلام اصلاح سے بے نیاز، ظفر علی خاں آمادۂ اصلاح، قاضی عبدالغفار ان سب کے حدِ اوسط ہیں۔

خود رشید احمد صدیقی کی طنز ومزاح میں ادبیت کے ساتھ گہرائی ہوتی ہے۔ جس میں فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ تعمیری جذبہ بھی ہوتا ہے۔

دیگر طنز ومزاح نگاروں کے یہاں گہری کاٹ کی وجہ سے سماجی بیداری کی آئینہ داری ملتی ہے۔

احمق پھپھوندوی، انجم مانپوری، شفیق الرحمٰن، شاد عارفی، فرقت کاکوروی وغیرہ کے یہاں بیان کی شوخی اور شگفتگی نمایاں ہے۔ فطانت و ذہانت نے اشاریت کے جو راستے کھولے ہیں ان سے محظوظ ہونے کا موقع ملتا ہے۔

درّاکی اور توانائی کے ساتھ طنز ومزاح کے سرچشمے کی آبیاری کرنے والوں میں راجہ مہندی علی خاں، راجندر سنگھ بیدی، فکر تونسوی، ابن انشا، رضا نقوی واہی، سید ضمیر جعفری، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، بھارت چند کھنہ، کرنل محمد خاں، احمد جمال پاشا، تخلص بھوپالی، خواجہ عبدالغفور، عطاء الحق قاسمی، نریندر لوتھر، دلاور فگار، شیفتہ فرحت، نصرت ظہیر، اسد رضا، مشفق خواجہ، مستنصر حسین تارڑ، دلیپ سنگھ، پرویز یداللہ مہدی، شیخ رحمٰن اکولوی، رؤف خوشتر، ابن صفی اور دیگر نے نفسیاتی، سماجی، جذباتی، سیاسی، واقعاتی، داخلی اور تخلیقی

شعور سے کام لے کر اظہار کی قدر کو سمجھا ہے، برتا ہے اور طنز و مزاح کے نئے خط و خال واضح کئے ہیں۔!

ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کی دنیا الگ ہے۔ اپنے طنز و مزاح سے انہوں نے عصر اور عہد کو محفوظ کیا ہے، ان کی ایسی تحریروں میں بلند حوصلگی ہے، عالی ظرفی ہے اور دور شناسی ہے۔ اچھے برے حالات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان کے کردار اثرات قبول کرتے ہیں جن میں کبیدہ خاطری نہیں ہوتی اور دل برداشتگی نہیں ہوتی بلکہ اسلوب کی تندی اور لب ولہجہ کی ترشی سے صداقت آشنائی ہوتی ہے۔ اور زندگی کی مضحکہ کن ناہمواریاں علم و آگہی اور محرکات کے آئینے تک مسکراتی ہیں۔ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں پر ابنِ صفی کی نظر گہری ہوتی ہے۔

ابنِ صفی کے ناولوں میں اہم کردار کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ کرنل احمد کمال فریدی، کیپٹن ساجد حمید، علی عمران، ایکسٹو، جولیانا فٹنر واٹر، بلیک زیرو، قاسم، انور، رشیدہ، سر سلطان، فیاض، جیمسن، ظفر الملک، تھریسیا، سنگ ہی، جیرالڈ شاستری، الفانسے، ٹسڈل، بوغا، علامہ دہشتناک، رحمٰن صاحب، جوزف، سلیمان، گل رخ، صفدر، تنویر، نعمانی، خاور، صدیقی، چوہان، روشی، عاصم صاحب، اماں بی، ثریا وغیرہ ایسے کردار ہیں جن کے گرد ابنِ صفی کے اعلیٰ تخلیقی جوہر اظہار پاتے ہیں اور جاسوسی کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ لیکن بھرپور طنز و مزاح کا رنگ چند ہی کردار بخشتے ہیں جن کی عکسی تصویر میں مسکان ہے، زندگی کے فریم میں آویزاں تبسم ہے، معاشرے کے غیر صحت مندانہ رجحانات پر تمسخر ہے، چھوٹے چھوٹے واقعات کے بڑے نتائج پر نشتر زنی ہے اور تہذیب اور شائستگی کے کسی بھی پہلو پر طنز کی کاٹ ہے۔ چھیڑ چھاڑ کے انداز میں ابنِ صفی مضحکہ خیز پہلو کو اجاگر کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے طنزیہ سماجی شعور نے بذلہ سنجی اور لطیف انشا پر خصوصی توجہ دی ہے اسی لئے ان کی مزاحیہ اور طنزیہ تحریر میں تازگی اور دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی زعفرانی اور شوخی بھری تحریر میں درس ہوتا ہے، تہذیب کی شگفتگی ہوتی ہے اور معاملات و حادثات کی حیرت انگیزی بھی ہوتی ہے۔

ابنِ صفی نے درج ذیل جاسوسی ناول لکھے ہیں

فریدی سیریز کے ناول (اشاعت کی ترتیب سے)

۱ دلیر مجرم
۲ خوفناک جنگل
۳ عورت فروش قاتل
۴ تجوری کا راز
۵ فریدی اور لیونارڈ
۶ پراسرار کنواں
۷ خطرناک بوڑھا
۸ مصنوعی ناک
۹ پراسرار اجنبی
۱۰ احمقوں کا چکر
۱۱ پہاڑوں کی ملکہ
۱۲ موت کی آندھی (خاص نمبر)
۱۳ بھیانک جزیرہ (خاص نمبر)
۱۴ عجیب آوازیں
۱۵ رقاصہ کا قتل
۱۶ نیلی روشنی
۱۷ شاہی نقارہ (خاص نمبر)
۱۸ خون کا دریا
۱۹ قاتل سنگریزے
۲۰ پتھر کی چیخ
۲۱ خوفناک ہنگامہ (خاص نمبر)
۲۲ دوہرا قتل
۲۳ چار شکاری
۲۴ بے گناہ مجرم
۲۵ لاشوں کا آبشار (خاص نمبر)
۲۶ مونچھ مونڈنے والی
۲۷ گیتوں کے دھماکے
۲۸ سیاہ پوش لٹیرا
۲۹ برف کے بھوت (خاص نمبر)
۳۰ پرہول سناٹا
۳۱ چیختے دریچے
۳۲ خطرناک دشمن
۳۳ جنگل کی آگ (خاص نمبر)
۳۴ کچلی ہوئی لاش
۳۵ اندھیرے کا شہنشاہ
۳۶ پراسرار وصیت
۳۷ موت کی چٹان (خاص نمبر)
۳۸ نیلی لکیر (خاص نمبر)

۳۹ تاریک سایے
۴۰ سازش کا جال (خاص نمبر)
۴۱ خونی بگولے (خاص نمبر)
۴۲ لاشوں کا سوداگر
۴۳ ہولناک ویرانے
۴۴ لیونارڈ کی واپسی
۴۵ پاگل خانے کا قیدی
۴۶ شعلوں کا ناچ (خاص نمبر)
۴۷ گیارہواں زینہ
۴۸ سرخ دائرہ
۴۹ خونخوار لڑکیاں
۵۰ سایے کی لاش (خاص نمبر)
۵۱ پہلا شعلہ
۵۲ دوسرا شعلہ
۵۳ تیسرا شعلہ
۵۴ جہنم کا شعلہ (خاص نمبر)
۵۵ زہریلے تیر
۵۶ پانی کا دھواں
۵۷ لاش کا قہقہہ
۵۸ ڈاکٹر ڈریڈ (خاص نمبر)
۵۹ شیطان کی محبوبہ
۶۰ پراسرار موجد
۶۱ انوکھے رقاص
۶۲ طوفان کا اغوا (خاص نمبر)
۶۳ رائفل کا نغمہ
۶۴ ٹھنڈی آگ
۶۵ جاپان کا فتنہ
۶۶ دشمنوں کا شہر (خاص نمبر)
۶۷ لاش کا بلاوا
۶۸ گارڈ کا اغوا
۶۹ شادی کا ہنگامہ
۷۰ زمین کے بادل (خاص نمبر)
۷۱ وبائی ہیجان
۷۲ اونچا شکار
۷۳ آوارہ شہزادہ
۷۴ چاندنی کا دھواں (خاص نمبر)
۷۵ سینکڑوں ہمشکل
۷۶ لڑاکوں کی بستی
۷۷ الٹی تصویر
۷۸ چمکیلا غبار (خاص نمبر)
۷۹ انوکھی رہزنی
۸۰ دھواں اٹھ رہا تھا
۸۱ فرہاد ۵۹
۸۲ زہریلا آدمی (خاص نمبر)
۸۳ پرنس وحشی
۸۴ بیچارہ/بیچاری

۸۵ اشاروں کے شکار (خاص نمبر)
۸۶ ستاروں کی موت
۸۷ ستاروں کی چیخیں
۸۸ ساتواں جزیرہ
۸۹ شیطانی جھیل (خاص نمبر)
۹۰ سنہری چنگاریاں
۹۱ سہمی ہوئی لڑکی
۹۲ قاتل کا ہاتھ (خاص نمبر)
۹۳ رلانے والی
۹۴ تصویر کا دشمن
۹۵ دیوپیکر درندہ (خاص نمبر)
۹۶ ٹسڈل کی بیداری
۹۷ خوفناک منصوبہ
۹۸ تباہی کا خواب (خاص نمبر)
۹۹ مہلک شناسائی (خاص نمبر)
۱۰۰ دھواں ہوئی دیوار
۱۰۱ خونی ریشے
۱۰۲ تیسری ناگن
۱۰۳ ریگم بالا (خاص نمبر)
۱۰۴ بھیڑیے کی آواز
۱۰۵ اجنبی کا فرار
۱۰۶ سایے کا قتل
۱۰۷ روشنی کی آواز
۱۰۸ روشن ہیولہ
۱۰۹ زہرو فتنہ
۱۱۰ ریت کا دیوتا
۱۱۱ سانپوں کا مسیحا
۱۱۲ ٹھنڈا جہنم
۱۱۳ عظیم حماقت
۱۱۴ زہریلا سیارہ (خاص نمبر)
۱۱۵ نیلم کی واپسی (خاص نمبر)
۱۱۶ موروثی ہوس
۱۱۷ دہشت گر
۱۱۸ شکاری پرچھائیاں
۱۱۹ پرچھائیوں کے حملے
۱۲۰ سایوں کا ٹکراؤ
۱۲۱ ہمزاد کا مسکن (خاص نمبر)
۱۲۲ صحرائی دیوانہ، حصہ اوّل (خاص نمبر)
۱۲۳ صحرائی دیوانہ، حصہ دوم (خاص نمبر)

عمران سیریز کے ناول

عام شمارے

۱۲۴ بھیانک آدمی
۱۲۵ چالیس ایک باون
۱۲۶ ہیروں کا فریب
۱۲۷ بلی چیختی ہے
۱۲۸ گیت اور خون
۱۲۹ تصویر کی اڑان
۱۳۰ گیارہ نومبر
۱۳۱ بحری یتیم خانہ
۱۳۲ ہلاکو اینڈ کو
۱۳۳ پہاڑوں کے پیچھے
۱۳۴ تصویر کی موت
۱۳۵ نادیدہ ہمدرد
۱۳۶ بیمبو کیسل
۱۳۷ معصوم درندہ
۱۳۸ بیگم ایکس ٹو
۱۳۹ کالی کہکشاں
۱۴۰ لاش گاتی رہی
۱۴۱ شمال کا فتنہ
۱۴۲ خوفناک عمارت
۱۴۳ چٹانوں میں فائر
۱۴۴ پراسرار چیخیں
۱۴۵ جہنم کی رقاصہ
۱۴۶ نیلے پرندے
۱۴۷ سانپوں کے شکاری
۱۴۸ رات کا شہزادہ
۱۴۹ دھوئیں کی تحریر
۱۵۰ لڑکیوں کا جزیرہ
۱۵۱ پتھر کا خون
۱۵۲ قبر اور خنجر
۱۵۳ آہنی دروازہ
۱۵۴ گمشدہ شہزادی
۱۵۵ حماقت کا جال
۱۵۶ شفق کے پجاری
۱۵۷ قاصد کی تلاش
۱۵۸ رائی کا پربت
۱۵۹ پاگل کتے
۱۶۰ کالی تصویر
۱۶۱ سوالیہ نشان

۱۶۲ خطرناک لاشیں
۱۶۳ گیند کی تباہ کاری
۱۶۴ چوتھی لکیر
۱۶۵ جہنم کی رقاصہ

عمران سیریز کے ناول

خاص نمبر

۱۶۶ پاگلوں کی انجمن
۱۶۷ پیاسا سمندر
۱۶۸ لاشوں کا انبار

عمران سیریز: سلسلہ وار ناول

۱۶۹ بے آواز سیارہ
۱۷۰ ڈیڑھ متوالے (خاص نمبر)
۱۷۱ گھر کا بھیدی
۱۷۲ موت کا مہمان
۱۷۳ ڈاکٹر دعاگو (خاص نمبر)
۱۷۴ لوبولی لا
۱۷۵ سہ رنگا شعلہ
۱۷۶ آتشی بادل (خاص نمبر)
۱۷۷ جونک کی واپسی (خاص نمبر)
۱۷۸ زہریلی تصویر (خاص نمبر)
۱۷۹ بے باکوں کی تلاش (خاص نمبر)
۱۸۰ دوسری آنکھ
۱۸۱ آنکھ شعلہ بنی (خاص نمبر)
۱۸۲ شوگر بینک (خاص نمبر)
۱۸۳ تابوت میں چیخ
۱۸۴ فضائی ہنگامہ (خاص نمبر)
۱۸۵ میناروں والیاں
۱۸۶ سبز لہو (خاص نمبر)
۱۸۷ بزدل سورما
۱۸۸ دست قضا
۱۸۹ ایش ٹرے ہاؤس
۱۹۰ عقابوں کے حملے
۱۹۱ پھر وہی آواز
۱۹۲ خونریز تصادم (خاص نمبر)

۱۹۳ کنگ چانگ
۱۹۴ دھوئیں کا حصار
۱۹۵ سمندر کا شگاف
۱۹۶ زلزلے کا سفر
۱۹۷ بلیک اینڈ وھائٹ (خاص نمبر)
۱۹۸ ادھورا آدمی
۱۹۹ آپریشن ڈبل کراس
۲۰۰ خیر اندیش
۲۰۱ پوائنٹ نمبر بارہ
۲۰۲ ایڈلاوا (خاص نمبر)
۲۰۳ شہباز کا بسیرا
۲۰۴ ریشوں کی یلغار
۲۰۵ خطرناک ڈھلان
۲۰۶ جنگل میں منگل
۲۰۷ تین سنکی (خاص نمبر)
۲۰۸ آدھا تیتر
۲۰۹ آدھا بٹیر
۲۱۰ علامہ دہشتناک
۲۱۱ فرشتے کا دشمن
۲۱۲ بیچارہ شہ زور (خاص نمبر)
۲۱۳ سہ رنگی موت
۲۱۴ متحرک دھاریاں
۲۱۵ جونک اور ناگن (خاص نمبر)

۲۱۶ خوشبو کا حملہ
۲۱۷ باباسگ پرست
۲۱۸ مہکتے محافظ (خاص نمبر)
۲۱۹ ہلاکت خیز (خاص نمبر)
۲۲۰ جنگل کی شہریت
۲۲۱ زیبرا مین
۲۲۲ مونالیزا کی نواسی
۲۲۳ خونی فنکار (خاص نمبر)
۲۲۴ موت کی آہٹ
۲۲۵ دوسرا رخ
۲۲۶ چٹانوں کا راز
۲۲۷ ٹھنڈا سورج (خاص نمبر)
۲۲۸ تلاش گمشدہ
۲۲۹ آگ کا دائرہ
۲۳۰ لرزتی لکیریں (خاص نمبر)
۲۳۱ پتھر کا آدمی
۲۳۲ دوسرا پتھر
۲۳۳ خطرناک انگلیاں
۲۳۴ کالے چراغ
۲۳۵ خون کے پیاسے
۲۳۶ الفانسے
۲۳۷ درندوں کی بستی (خاص نمبر)

۲۳۸ آتش دان کا بت
۲۳۹ جڑوں کی تلاش
۲۴۰ خطرناک جواری
۲۴۱ ظلمات کا دیوتا (خاص نمبر)
۲۴۲ رات کا بھکاری
۲۴۳ آخری آدمی (ابنِ صفی کے انتقال کے بعد شائع ہوا)

انور اور رشیدہ سیریز کے ناول

۲۴۴ ہیرے کے کان
۲۴۵ تجوری کا گیت
۲۴۶ آتشی بادل
۲۴۷ خونی پتھر
۲۴۸ ساڑھے پانچ بجے
۲۴۹ پیش گوئی کا شکار

ایرج اور اقرب سیریز کے ناول

۲۵۰ معزز کھوپڑی
۲۵۱ بلدران کی ملکہ

ابنِ صفی کا ناول ''صحرائی دیوانہ'' دو حصے میں ہے۔ دوسرے حصے کا پورا کارنامہ تحیر اور تجسس کی بڑی عجیب وغریب منزلوں سے گذرتا ہے اور ذہنوں پر ایک لافانی نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اس کہانی میں فریدی اور حمید اپنے مخصوص انداز میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ سرگرمیاں تشنہ رہ جاتیں اگر قاسم کی مضحکہ خیز حرکتیں قہقہوں کی بارش نہ کرتیں۔ اس کا وجود کہانی کی دلچسپیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ دردانہ سے اس کی لگاوٹ خاصی پرُ لطف ہے۔ موجی بابا کا کردار اس کہانی میں مزید کرید اور دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ حمید کی اُس سے غیر معمولی عقیدت کہانی میں ایک نیا رخ پیدا کرتی ہے اور آخر وقت تک موجی بابا کا کردار ایک سوالیہ نشان کی طرح ذہنوں میں ابھرتا رہتا ہے۔ فریدی کے حوالے سے اس میں طنز بھی بہت ہے۔ امریکہ میں جرائم کی زیادتی پر فریدی کا طنز دیکھئے:

''حمید اس سے کہہ رہا تھا'' ہمارے یہاں بھی اب جرائم کی تعداد بڑھ رہی

ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں جرائم کے معاملے میں ہم امریکہ پر بھی سبقت نہ لے جائیں''۔

''تمہارا خیال غلط ہے۔ یہاں کبھی ایسا نہ ہو سکے گا کیونکہ ہم ہزار ہا سال سے قارئین کی حدود میں زندگی بسر کر رہے ہیں''۔ فریدی بولا ''امریکہ کی بیک گراؤنڈ دوسری ہے۔ وہاں پہنچنے والے سفید فام اقوام کے افراد کی زندگیوں کی ابتدا ہی آزادانہ ہوئی تھی۔ اور وہ خود ہی قانون تھے''۔

(صحرائی دیوانہ، حصہ دوم)

آدمی کی وقعت اور خدا کی افضلیت پر ناول ''دہشت گر'' میں زبردست طنز ہے۔ ''دہشت گر'' کی پوری کہانی تحیر اور استعجاب سے بھرپور ہے۔ کرنل فریدی اپنی پروقار شخصیت کے ساتھ پراسرار واقعات کی گتھیوں کو اس طرح سلجھاتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ اور اس کا سنجیدہ طریقۂ کار سراغرسی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتا ہے۔ کیپٹن حمید کی دلچسپ شرارتیں اپنے پورے شباب پر ہیں، قاسم سے اس کی نوک جھونک دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ اس بار قاسم ہپّی کی شکل میں اپنی بوکھلاہٹوں کے نئے شگوفے چھوڑتا ہے۔ یہ ناول اپنے دامن میں دلچسپیوں کی ایک نئی فضا لئے ہوئے ہے فریدی کے حوالے سے یہ طنز دیکھئے:

''آپ کون ہیں؟''۔

''میرا نام احمد کمال فریدی ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تھی میری جب شمشاد محل میں کچھ دنوں کے لئے میرا قیام ہوا تھا۔ خاں محی الدین اور میرے باپ اچھے دوست تھے''۔

''میرے خدا''۔ ناصر خاں پھر اٹھ بیٹھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے فریدی کا بازو پکڑ کر بولا ''آپ کرنل فریدی تو نہیں ہیں۔ نواب عزیز الدین خاں کے بیٹے''۔

''مجھے افسوس ہے کہ ایسے حالات میں ملاقات ہوئی''۔

''میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اس طرح ذلیل کر رہا ہے وہ شریفوں کو''۔

''بے فکر رہئے۔ فرعونیت کی عمر تھوڑی ہوتی ہے''۔

''وہ یہاں کا شہنشاہ ہے۔ اس کے خلاف کچھ بھی کیجئے اوپر والوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی''۔

''بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، لیکن آدمی، آدمی ہی رہے گا۔ خدا نہیں بن سکتا''۔

(دہشت گر)

یہ سچ ہے کہ ابنِ صفی نے اردو ادب میں ایک نئی تاریخ کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا قلم اپنے اندر وہ شگفتگی اور شادابی رکھتا ہے جسے دیکھ کر گل و لالہ کی رعنائی شرما جاتی ہے۔ اس کے اندر وہ بے پناہ طاقت ہے کہ کبھی رومان کے سمن زاروں کی لوریاں سناتا ہے، کبھی دیوار قہقہہ کی چلتی پھرتی صورتیں لاتا ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ کبھی استعجاب کا سمندر ہے، کبھی پیچیدہ، پراسرار، سنسنی خیز واقعات کے حسین طلسم کی فسوں کاری ہے۔ ان کے ایک ناول ''مونچھ مونڈنے والی'' میں بھی یہ سب کچھ ہے کہ دل کی دھڑکنوں سے سوال نکلتے ہیں آخر کلاوتی کون ہے؟ جے سیکا جیسی خوفناک حد تک ذہین لڑکی کو فریدی نے کیوں چھوڑ دیا؟ مونچھ مونڈنے کے پیچھے کون سا راز تھا؟ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا عجیب وغریب کیمرہ کیسا تھا؟ لیکن ان سب کے بیچ فریدی اور حمید محاورہ کی بوالعجبی پر بات کرتے ہیں، اس کے استعمال پر مثال پیش کرتے ہیں:

''بہت اونچے اڑ رہے ہیں آج''۔ حمید مسکرا کر بولا۔

''کب نہیں اڑتا۔ اچھا باتیں بند۔ تمہارا اوپری ہونٹ یونہی ہر وقت دست بدعا رہتا ہے اور جب بولنے لگتے ہو تو ناک سے جا ملتا ہے۔ ذرا بھینچو اسے۔ ٹھیک ـــ لیکن یاد رہے کہ میک اَپ کے باوجود بھی تمہاری آنکھوں پر تاریک عینک ہونی چاہئے۔ جے سیکا کی نظریں بہت تیز ہیں۔ جو اسکاٹ لینڈ یارڈ کا مخصوص کیمرہ غائب کر سکتی ہے نرمی ڈیوٹ ہی نہ ہوگی''۔

''بہرحال اس کے دن پورے ہو گئے!''۔

"اوہو" فریدی مسکرا کر بولا "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"کیا مطلب؟"۔

"اگر اس کے دن پورے ہوگئے ہیں تو تم پر کسی دائی یا نرس ہی کا میک اَپ زیادہ مناسب رہتا۔"

حمید جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"عجیب بات ہے"۔ فریدی نے ہنس کر کہا "محاورہ ایک ہی ہے لیکن استعمال کے معاملے میں جنس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں"۔

"محاورے پر ایک بات یاد آتی ہے"۔ حمید نے کہا "ایک صاحب کی سسرال سے خبر آئی کہ ان کی بیوی کا پاؤں بھاری ہوگیا ہے۔ محاوروں کے معاملے میں ذرا کچے تھے۔ سمجھے شاید Elephantisis (فیل پا) ہوگیا ہے۔ فوراً گھبرا کر تار دیا کہ روپے بھیج رہا ہوں۔ علاج شروع کرو۔ جواب میں بذریعہ تار پوچھا گیا کہ کس بات کا علاج؟۔ اس پر آپ نے ایک لمبا چوڑا تار روانہ کیا۔ مرض خطرناک ہے۔ ابھی شروعات ہے۔ علاج کارگر ہوجائے گا ورنہ پھر زندگی بھر اس سے پیچھا چھڑانا محال ہوجائے گا۔ وہاں سے جواب آیا جو شاید ان کے سسر نے دیا تھا کہ بزرگوں سے مذاق کرتے شرم نہیں آتی۔ اس پر بڑا تاؤ آیا ان حضرت کو۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں کو غصہ عموماً اردو ہی میں آتا ہے، لہٰذا اس بار انہوں نے اردو میں خط لکھا۔ پتہ نہیں آپ لوگ کیسے ہیں! علاج کیجئے ورنہ منہ کی کھانی پڑے گی۔ روپے بھیج چکا ہوں۔ ایک ایک پائی میری بیوی کے علاج پر صرف ہونی چاہئے، ورنہ میں اپنے قریب کسی ایسی عورت کا وجود برداشت نہ کرسکوں گا جس کا ایک پاؤں یا دونوں پاؤں بھاری ہوں۔ اللہ آپ لوگوں کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ ادھر ان کے سسرال والے بھی جو غالباً شاہ مدار

اور غازی میاں کے متقدمین میں سے تھے بری طرح تاؤ کھا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق تک کی نوبت آگئی"۔ (مونچھ مونڈنے والی)

فریدی جتنا سنجیدہ کردار ہے اس کا طنز بھی اتنا ہی نشتر چبھونے والا ہوتا ہے۔ ادب اور سیاست کے میل پر اس کا طنز بڑا گہرا ہے۔ ناول "دیو پیکر درندہ" میں ایسے کئی مواقع ملتے ہیں۔ اپنی کہانی اور کردار کے انوکھے پن کی وجہ سے یہ ناول ایک ناقابل فراموش شاہکار ہے۔ جسم وذہن کی تبدیلی مجرموں کی ایک بھیانک اور انوکھی ایجاد ہے۔ اس قسم کے متعدد حادثات وادئ سرخاب میں رونما ہوتے ہیں اور سب سے پہلے کرنل فریدی کے ڈی آئی جی اس حادثے کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن فریدی کی دوربین آنکھیں ان واقعات کے پیچھے چھپی ہوئی بھیانک سازش کو تلاش کرلیتی ہیں جو پوری انسانیت کے لئے تباہ کن تھی:

"وہ بھی رک گئے۔ فریدی نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر وہ بھی اسی کے انداز میں ہوا میں کچھ سونگھنے لگا۔

پھر مسکرا کر بولا ہاں...... کہیں آس پاس انگاروں پر گوشت بھونا جارہا ہے"۔

"اب دیکھنا ہے کہ اس امریکہ کی دریافت کا سہرا کس کولمبس کے سر رہتا ہے"۔ حمید بولا۔

"تم واقعی بہت بھوکے معلوم ہوتے ہو۔"

"نہیں صاحب افواہ ہوگی۔ قوم کے خادموں کو بھوک پیاس کب لگتی ہے۔ یہ تو عوامی قسم کی بدعتیں ہیں"۔

"نہیں بھوکے ہی معلوم ہوتے ہو، جب ادب اور سیاست ایک ساتھ حملہ آور ہوں تو یہی سمجھنا چاہئے۔ خیر چلو پہلے یہی دیکھ لیں کہ یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے"۔ (دیو پیکر درندہ)

اسی ناول سے انسان کی گھٹتی طاقت اور ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنانے کے بارے میں یہ طنز دیکھئے:

"لیکن اس کا مقصد کیا ہے ڈاکٹر ٹنڈل"۔ فریدی نے بیحد نرم لہجے میں

پوچھا۔

''کسی قسم کا تجربہ بجائے خود ایک مقصد ہوتا ہے''۔

''بھلا اس تجربے کی ضرورت کیوں پیش آئی''۔

''موجودہ انسانی نسل بیکار ہو چکی ہے۔ تم مجھے دیکھ ہی رہے ہو، میں آدمی سے زیادہ آدمی کی پرچھائیں معلوم ہوتا ہوں۔ میرے قویٰ مضبوط نہیں۔ میرا باپ بھی ایسا ہی تھا۔ دادا اس سے کچھ توانا تھا لیکن پردادا کے متعلق سنا ہے کہ وہ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا کرتا تھا''۔

''محض اتنی سی بات کے لئے ٹنڈل؟''

''تم اسے اتنی سی بات کہہ رہے ہو۔ حالانکہ آج دنیا میں اسی بنا پر تباہی پھیلی ہوئی ہے۔ ایٹم اور ہائیڈروجن بم بن رہے ہیں۔ زہریلی گیسیں دریافت کی جا رہی ہیں۔ کیا یہ سب اسی لئے نہیں ہو رہا ہے کہ دشمن سے نپٹنے کے لئے اپنی قوت بازو پر اعتماد نہیں رہا۔ ابتدا میں آدمی ایک دوسرے سے اس طرح گتھ جاتے ہوں گے جیسے کتے لڑ پڑتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے وحشت اور طاقت گھٹتی گئی وہ دشمن سے ذرا کچھ دور رہ کر وار کرنے کی سوچتا گیا۔ اسی طرح وہ لٹھوں اور ڈنڈوں سے بتدریج ایٹمی دور تک آ پہنچا''۔

(دیو پیکر درندہ)

ایسا ہی زبردست طنز ناول ''دوسرا شعلہ'' میں ملتا ہے۔ دلچسپ سائنسی کارناموں سے بھرپور ایڈونچر اور سراغرسی کا ایک سلسلہ ہے جسے ابنِ صفی کا قلم ہی پیش کرسکتا ہے:

''ان کا طرز حکومت جمہوری کہلاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مغز چند آدمیوں کے حصے میں آئے اور ہڈیاں عوام کے آگے ڈال دی جائیں۔ یہ اپنے مسائل طاقت ہی سے حل کرتے ہیں مگر اسے اشتراک باہمی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے حاکم خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں۔ عوام ہی انہیں حکومت کے لئے منتخب کرتے ہیں لیکن یہ ان کی مالی قوت ہی ہوتی ہے جو

انہیں اقتدار کی کرسی پر پہنچاتی ہے لیکن وہ اسے عوام کی قوت اور رائے عامہ کہتے ہیں۔ حالانکہ رائے عامہ مالی قوت ہی سے خریدی جاتی ہے، انہیں منتخب ہونے کے لئے اپنے مخالفوں کے خلاف بڑے بڑے محاذ قائم کرنے پڑتے ہیں۔ ایک خطرناک قسم کی جدوجہد شروع ہوتی ہے اور اس جنگ کو ''رائے عامہ ہموار کرنا'' کہا جاتا ہے''۔

(دوسرا شعلہ)

جمہوریت کے سلسلے میں ایک اور دلیل ناول ''شعلوں کا ناچ'' میں ملتی ہے۔ ابنِ صفی کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تحیر، سنسنی اور خوفناک واقعات کے ہجوم میں روشن اور تابناک خیالات کی مشعلیں جلاتے ہیں۔ ان کے طنز ومزاح کی نشتریت دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے:

''میں دراصل قلعہ مقلاق کو تنظیم کا مرکز بنانا چاہتا ہوں۔ تم خود سوچو، کیا اس کے بعد گوبرشاہی ''طاقت'' سے ٹکرا سکے گی۔ میں کوہستانی باشندوں کو نئے آلات حرب سے مسلح کروں گا۔ اوہو...... تم گوبرشاہی پر ابھی تک ہنس رہی ہو۔ میں جمہوریت کو گوبرشاہی کہتا ہوں۔ کیونکہ تیور اس کے بھی شاہانہ ہوتے ہیں لیکن چونکہ حکومت کرنے والے بہ آسانی بیچے اور خریدے جا سکتے ہیں اس لئے انہیں گوبر ہی سے تشبیہہ دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے''۔

(شعلوں کا ناچ)

ناول ''پانی کا دھواں'' میں حمید کی اخلاقیات بکرے پر آکر رکتی ہے۔ یہ ناول سراغرسی اور تجسس کا ایک نیا اور انوکھا معیار پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کی شروعات اردو غزل، کلیم الدین احمد کے قول ''نیم وحشی صنف سخن'' اور ادبی اور ملکی ترقی سے ہوتی ہے جس کے بیان میں گہرا طنز ہے:

''حمید کا بکرا اگر آدمی ہوتا تو وہ یا تو اب تک خودکشی کر چکا ہوتا یا نقاد ہو جاتا اور اُردو غزل کے متعلق یہی خیال ظاہر کرتا کہ اس نیم وحشی صنف سخن کی گردن بے تکان مار دینی چاہئے کیونکہ حمید اس وقت بھی اسے ایک غزل

ہی سنا رہا تھا۔ مگر بکرے نہ تو خودکشی کر سکتے ہیں نہ تنقید۔ ویسے اگر وہ آدمی ہوتا تو یہ بھی ممکن تھا کہ غزل کی گردن مارنے کی بجائے حمید ہی کی گردن اُڑا دیتا۔

حمید نے دوسری غزل شروع کی اور بکرے نے ہری ہری دوب پر منہ مارنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ پر ایک تھپڑ پڑا۔ اور غزل مکمل نہ ہو سکی کیونکہ حمید نے اب نثر شروع کر دی تھی ''ابے، فِلٹ ہیٹ پہن کر گھاس کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ چینیوں نے اتنی ترقی کی، جاپانی اتنے بڑھ گئے مگر تو ہمیشہ بکرا ہی رہے گا''۔ (پانی کا دھواں)

اسی ناول میں جگہ جگہ دیواروں پر طرح طرح کی تحریریں لکھ کر متوجہ کرنے کی وبا عام ہے۔ فائدہ اور نقصان اپنی جگہ پر لیکن حمید کے طنز میں جو سچائی ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے:

''دروازہ بند کر دیا گیا۔ حمید تنہا رہ گیا۔ لیکن اس نے اپنا شغل جاری رکھا۔ میز سے دوات اٹھائی اور اس میں انگلی ڈبو کر دیواریں خراب کرنے لگا۔ وہ لکھ رہا تھا ''اور جب وہ زمین پر آیا تو یہ زمین جنت بن گئی لیکن فرشتوں نے اسے سولی پر چڑھا دیا۔ فرشتوں نے اس کا سارا اثاثہ لوٹ لیا۔ وہ پھر واپس آئے گا''۔

دوسری جگہ لکھا ''بہت جلد آرہا ہے۔ پیار کا ہنڈولا۔ اداکاران ثریا، گوپ، شیخ مختار، برٹرانڈ رسل، اسٹیفن اسپنڈر، پبلو نرودا، ککو، ناصر خاں''۔

تیسری جگہ لکھنے لگا ''جب دنیا کا خاتمہ ہونے لگے گا، جب تم بے یار و مددگار ہو گے، سنیما کی کھڑکی کے نیچے بہت لمبی لائن ہوگی، تمہیں بلیک سے ٹکٹ خریدنے پڑیں گے، اُس دن تمہیں کانن بالا یاد آئے گی، مادھوری یاد آئے گی، امیر کرناٹکی یاد آئے گی، ماسٹر نثار ہارمونیم بجائے گا، ماسٹر وٹھل کی ٹھائیں ٹھائیں ہوگی۔ انقلاب زندہ باد''۔

پھر اس نے اُس قسم کی گالیاں لکھنی شروع کر دیں جیسی اکثر پبلک پیشاب

خانوں میں نظر آتی ہیں''۔ (پانی کا دھواں)

ابنِ صفی جب اپنی نوعیت کا منفرد کام کرتے ہیں اور جاسوسی ناولوں کو تاریخیت عطا کرتے ہیں تو خوش ذائقہ بنانے کے لئے انسانی مزاج اور کرداروں کی نفسیات کو رنگارنگی عطا کرتے ہیں۔ حمید ٹرین میں سفر کر رہا ہے۔ مسافروں میں ایک بہرا شخص بھی ہے۔ وہ حمید سے مخاطب ہوتا ہے:

''کیا وقت ہوا ہے جناب''۔

''بارہ''۔ حمید نے جواب دیا۔

''کمال ہے''۔ وہ برا سا منہ بنا کر بولا ''میں نے وقت پوچھا ہے۔ غبارے سے مجھے کیا سروکار''۔

''غبارہ نہیں ـــ بارہ۔'' حمید نے چیخ چیخ کر کہا۔

''ارے تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے''۔ جواب ملا۔

حمید نے پاؤچ سے تمباکو نکال کر پائپ بھرا اور اسے دیا سلائی دکھا کر دو تین لمبے لمبے کش لئے۔

''کون سا تمباکو پیتے ہیں آپ''۔ بوڑھے نے پوچھا۔

''پرنس ہنری''۔

''ہری تمباکو چل ہی نہیں سکتی پائپ میں۔ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کیجئے''۔

''ہری نہیں ـــ پرنس ہنری''۔

''واہ یہ بھی کوئی نام ہوا ـــ پرنس ہنری ـــ ہونہہ''۔

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں''۔ حمید چڑھ گیا۔

''اگر بولیں بھی تو میرا کیا بگڑے گا''۔ بوڑھے نے برا سا منہ بنا کر خشک لہجے میں کہا۔

حمید خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اگر کمپارٹمنٹ میں کوئی لڑکی بھی موجود

ہوتی تو وہ یقینی طور پر اس بوڑھے سے چمٹ گیا ہوتا۔

"کہاں تشریف لے جائیں گے"۔ بوڑھے نے پھر کچھ دیر بعد پوچھا۔

"جہنم میں"۔

"اچھا۔" بوڑھے نے اس بار بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا تھا۔

(گارڈ کا اغوا)

حمید کا پیچھا ابھی اس بوڑھے سے نہیں چھوٹا ہے۔ دونوں کی چہل سے بقیہ مسافر محظوظ ہوتے ہیں:

"تعلیم کہاں تک ہے تمہاری"۔ اس نے حمید سے پوچھا۔

"تسلیم — تسلیم"۔ حمید نے جھک کر خالص لکھنوی انداز میں اسے سلام کیا۔

"تسلیم نہیں تعلیم"۔ بوڑھا چیخ کر بولا۔

"ارے تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے"۔ حمید نے اسی کے لہجے کی نقل اتاری۔

"جدا تو ہونا ہی پڑے گا"۔ بوڑھے نے سر ہلا کر کہا "اور نہیں تو کیا میں تمہیں اپنی قبر میں لے جاؤں گا"۔

لوگ بے ساختہ ہنسنے لگے۔ اور حمید انہیں غصیلی نظروں سے گھور کر بوڑھے سے بولا "میں اس وقت بہت اداس ہوں۔ اس لئے براہ کرم خاموش رہئے"۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہارا نام دیوداس ہی ہوگا۔ صورت ہی سے ظاہر ہے"۔ بوڑھے نے کہا۔

"آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں"۔ حمید غصیلے لہجے میں بولا "میں سفر میں بے تکلفی کا قائل نہیں ہوں"۔

"قبائل کے متعلق تم مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتے۔ میں نے اپنی زندگی کے پندرہ سال قبائلیوں کے ساتھ گذارے ہیں"۔

"خدا آپ کو غارت کر دے"۔

"ہاں، وزارت کا شوق ہے مجھے مگر وقت نہیں ملتا"۔ بوڑھے نے سر ہلا کر جواب دیا۔

(گارڈ کا اغوا)

الفاظ ابنِ صفی کے اختیار میں تھے۔ ان سے وہ لہو کی گردش تیز کرنے کا کام لیتے تھے:

"تم خود مرو گے اور بہت جلد مرو گے۔ چچی کا چمڑے کا چابک — ملک الموت سے کم نہیں"۔

"چچی، چمڑا، چابک"۔ حمید نے قہقہہ لگایا "اور چ سے کیا ہوتا ہے۔ چھچھوندر، چغد، چمگادڑ، چور، چمار — ہاہا"۔

"اچھا! تم یہ سب کچھ چچی کو کہہ رہے ہو۔ اچھا اچھا۔" شہرزاد بولی۔

"آپ کا نام بھی چ سے چہرزاد ہونا چاہئے۔"

(شعلوں کا ناچ)

حمید اور قاسم یکجا ہوں تو پڑھنے والوں کو ہر حال میں تفریح ملتی ہے۔ ناول "چاندنی کا دھواں" میں دونوں ایک لڑکی کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کہانی میں مصنف نے بڑے خوابناک اور سحر انگیز ماحول کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ایسے سحر کار ماحول کی تخلیق صرف ابنِ صفی ہی کا حصہ ہے۔ یہ ناول ایک ایسا دلچسپ شاہکار ہے جس میں ایڈونچر بھی ہے، سراغرسی بھی اور سائنسی انکشافات بھی۔ اور ان سب کے ساتھ ہنسی اور مزاح کی چاشنی ذہن پر بہت خوشگوار اثر ڈالتی ہے:

"قاسم بھائی کیا بتاؤں"۔ حمید مسمسی صورت بنا کر بولا "میں تو بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں، اب تم ہی جو کچھ کرنا چاہو کرو"۔

"قیا قرنا ہے...... غوک......" وہ نوالہ حلق سے اتارتا ہوا بولا۔

"وہ لڑکی دراصل میں نے تمہارے لئے منتخب کی تھی مگر وہ الو کا داماد......"

"الو کا داماد"۔ قاسم حیرت سے آنکھ نکال کر بولا "امے نہیں...... ہاہاہاہا"۔

"یعنی کہ وہی پلپلے خاں جھٹک لے گیا اس لڑکی کو۔ پتہ نہیں کیوں وہ بھی اسی پر لٹو ہو رہی ہے"۔

"لٹو ہو رہی ہے"۔ قاسم نے پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"لٹو.....لٹو"۔

"لٹو کیا ہوتا ہے حمید بھائی"۔ قاسم نے بے بسی سے پوچھا۔

"ابے لٹو ہونا محاورہ ہے"۔

"اچھا تو وہ سالی محاورہ ہوگئی ہے"۔ قاسم سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ پھر اچانک سر اٹھا کر کہا "یار— کیا بات ہوئی۔ وہ محاورہ کیسے ہوسکتی ہے۔ محاورہ کیا چیز ہے۔ اسے تو شاید قاملہ کہتے ہیں"۔

"ہائیں یہ قاملہ کیا بلا ہے"۔ حمید اسے گھورنے لگا۔

قاسم دونوں آنکھیں مار کر مسکرایا اور آہستہ سے بولا "ابے وہ پیٹ میں بچہ وچہ"۔

"الو کے پٹھے"۔ حمید کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور ساتھ ہی قہقہے کی دھار بھی"

(چاندنی کا دھواں)

اسی ناول میں ایک جگہ فریدی، قاسم، آصف اور زیبا نام کی ایک لڑکی آپس میں گفتگو کر رہے ہیں اور بے تکے الزامات لگا رہے ہیں۔ حمید سائنسی معجزے کی وجہ سے ایک کھوپڑی میں سما گیا ہے۔ اس کے لئے قاسم کے جذبات اس طرح ہیں:

"نہیں جناب یہ غلط ہے"۔ زیبا بولی "میں کوئی رئیس زادی نہیں ہوں کہ اس طرح سیر تفریح کرتی پھروں۔ مجھے دو ماہ کے لئے ملازم رکھا گیا تھا۔

واہ یہ اچھی رہی"۔

"کس نے ملازم رکھا تھا"۔ آصف آنکھیں نکال کر بولا۔

"آپ کے سکریٹری نے"۔

"تو وہی تنخواہ بھی ادا کرے گا"۔

"میں ادا قروں گا"۔ قاسم چھاتی ٹھونک کر بولا "ابے ایسے حمید بھائی پر ہزاروں نثار کر سکتا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ ہاں جی بتاؤ کتنی تنخواہ طے ہوئی تھی"۔

"ڈھائی سو"۔ زیبا نے جواب دیا۔

یک بیک قاسم کی آواز گلوگیر ہوگئی، ذہنی رو بہک گئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی

تھیں اور پھر باقاعدہ طور پر آنسو بہنے لگے۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ کھوپڑی میں گھس گیا۔ منع کرتا تھا، دیکھو حمید بھائی لونڈیوں کا چکر برا ہوتا ہے، اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ ہائے میں کیا کروں کرنل صاحب۔ اُس سالی زہرہ سخت اخلاق کا پتہ لگائیے"۔

"اس کا پتہ کہاں لگاؤں۔ ہوا سے کون لڑے گا۔ صبر کرو"۔

"ہائے کیسے صبر کروں"۔ قاسم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "کلیجے کو منہ آرہا ہے۔ اب ایسا پیارا بھائی کہاں ملے گا۔ ہائے سب کچھ یاد آرہا ہے۔ کہتا تھا دیکھو پیارے، یہ ڈگیاں— فل فلوٹیاں— یلا یلیاں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ ہائے وہی ہوا۔ آسیب کو لونڈیا سمجھ کر کھوپڑی میں سما گیا، ارے باپ رے"۔ قاسم اچھل کر کھڑا ہوگیا"۔

(چاندنی کا دھوا)

اسی ناول میں مزاح کے کئی رنگ ہیں۔ دل کی آنکھیں کھلنے اور محبت کرنے کے طریقے کی ایک مثال دیکھئے:

"بیٹا پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے دل کی آنکھیں کیسے کھلی تھیں۔ یہ تم نے آج تک نہیں بتایا۔ حالانکہ آج تمہیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے"۔

"نہیں بتاؤں گا۔ ورنہ تم جیبا ڈارلنگ پر شک کروگے۔ میں جانتا ہوں سالے جہاں پناہ حمید بھائی تم اور کرنل صاحب بہت شکی ہو۔ جرا جرا سی بات پر شک۔ ایسی کی تیسی"۔ قاسم برا سا منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔

"تم سمجھے نہیں پیارے"۔ حمید نے سنجیدگی سے کہا "دل کی آنکھیں صرف وہی لڑکی کھولتی ہے، جو واقعی محبت کرتی ہے"۔

"کرتی ہے نا"۔ قاسم خوش ہو کر بولا اور خوشی کا مظاہرہ کرتا ہی رہا "ہی...... ہی......ہی"۔

مگر حمید ہاتھ اٹھا کر بولا "ہر لڑکی کا طریقہ الگ ہوتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ زیبا نے کون سا طریقہ اختیار کیا تھا"۔

"ہائے جہاں پناہ بھائی کیا بتاؤں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھ سے محبت
کرو ورنہ میں مرجاؤں گا— اس نے کہا تم خود ہی کرو نا مجھے کیا پڑی ہے۔
میں نے رو کر کہا تھا کہ مجھے محوبت کرنا نہیں آتا۔ اس نے کہا میں سکھاؤں
گی۔ دل کی آنکھیں خولوں محوبت ہوجائے گی۔ میں نے کہا کیسے خولوں
مجھے یہ بھی نہیں آتا۔ اس نے کہا ایک گھنٹے تک آنکھیں بند رکھو۔ میں نے
کوشش کی مگر یہ سالی آنکھیں بار بار کھل جاتی تھیں۔ آخر اس نے کوئی چیز
اوپر چپکا دی، پھر سالیاں کھل ہی نہ سکیں۔ اس نے کہا اب چلو چل کر ٹھنڈی
ہوا میں بیٹھیں خیمے کے پیچھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خیمے کے پیچھے لائی۔
وہاں بیٹھ کر ہولے ہولے میرا سر سہلانے لگی— ہائے حمید بھائی— کتنا
پیار تھا— کتنا پیار تھا"۔ (چاندنی کا دھواں)

مزاح کی پھلجھڑیاں ناول "رولانے والی" میں خوب چھوٹتی ہیں۔ حمید اور قاسم کی یہ
چھیڑ چھاڑ دیکھئے:

"تین بار نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری طرف سے قاسم کی دہاڑ سنائی دی

"قون ہے۔ میں سو رہا ہوں"۔

"بالکل الو کے پٹھے ہو۔" حمید نے آواز بدل کر کہا۔

"قیا— ابے ہوش— ہوش میں تو ہے"۔

"تمیز سے بات کرو ورنہ مار مار کر بھُس بھر دوں گا"۔ حمید نے کہا۔

جواب میں قاسم نے شاید گالیاں ہی دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن غصے اور
بوکھلاہٹ میں وہ گالیاں معنویت کی حامل نہیں ہوسکی تھیں۔

"یہ کتوں کی طرح کیا بھونک رہا ہے"۔ حمید نے کہا۔ غالباً قاسم سانس لینے
کے لیے رک گیا تھا۔ لیکن پھر دوسری طرف سے آواز نہیں آئی۔ ویسے
سلسلہ بھی منقطع نہیں کیا گیا تھا۔

"ابے ریسیور ہاتھ میں لئے ہی سوگیا کیا؟"۔ حمید نے پھر کہا۔

"ابے قون ہے..... سالے"۔ قاسم کی دہاڑ سنائی دی۔ غالباً اس سے پہلے
غصے اور حیرت کی زیادتی کی بنا پر کچھ نہ کرسکا ہوگا۔

"میں قوئی بھی ہوں۔ لیکن تمہیں آج رات بھر سونے نہیں دوں گا"۔

"اوع..... غرامی..... قون ہے قوع....." اس بار قاسم حلق کے بل چیخا تھا۔

حمید اس کی عادت سے واقف تھا کہ ہار مان کر ریسیور نہیں رکھے گا۔ جتنی
دیر چاہو الجھائے رہو۔ اس سے پہلے بھی اکثر وہ جی بہلانے کے لئے ایسی
حرکتیں کر چکا تھا لیکن کبھی قاسم کو اس کا علم نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ حرکت
اسی کی ہوتی ہے۔

"میں تمہارا خون پی لوں گا ورنہ زبان کو لگام دو سور کے بچے"۔ حمید نے کہا۔

"جبان..... ابے اپنی جبان بھی تو دیخ..... اللہ غارت کردے اِسے۔ سالا
اپنی جبان نہیں دیختا"۔

"تمہیں تمیز ہی سے گفتگو کرنی چاہئے۔ میں چاہے کتنی ہی گالیاں کیوں نہ
دوں"۔

"تیرے باپ کے دادا کی دھونس ہے قوئی"۔ قاسم کی دہاڑ سنائی دی۔

"صرف میں ہی کافی ہوں تمہارے لئے۔ باپ دادا کو کون تکلیف دے۔
اُلو کے پٹھے"۔

"بہت جلد مرے غا سالا تم..... دو ماہ بعد پھر جی جلانے قو جگایا ہے مجھے"۔

"اب تو روز جگاؤں گا..... مرغی کے تخم"۔

"ابے..... ابے..... یہ کیا گالی ہوئی..... مرغی کے تخم"۔ غالباً قاسم کی ذہنی
رو بہک گئی تھی۔

"ترکی زبان میں یہی چلتی ہے"۔

"چلتی ہوگی..... مگر تم....."۔

"میں ایک لڑکی ہوں۔ آواز بدل سکتی ہوں"۔

"نہیں"۔

"ہاں— پیارے۔!"۔اِس بار حمید نے باریک سی نسوانی آواز نکالی۔اور جواب میں دوسری طرف سے قاسم کی "ہی ہی ہی ہی" سنائی دینے لگی۔اور پھراس نے کہا "توتم مجھے غالیاں......قیوں دیتی رہتی ہو"۔

"محبت میں پیارے...... چڑانے کے لئے......"۔

"تو آواج بھاری قرنے کی قیا جرورت ہے۔ اپنی میٹھی والی آواج میں غالیاں دیا قرو......الاقسم ہنس ہنس کرسنوں گا......ہی ہی ہی ہی"۔

"واقعی الو کے پٹھے معلوم ہوتے ہو۔"

"بالقل بلقل......ہی ہی ہی ہی"۔

"تم مجھے دیکھتے ہی رہتے ہولیکن کبھی نہ جان سکو گے کہ وہ میں ہی ہوں"۔ حمید نے کہا۔

"الاقسم بتادو...... تمہیں میری جان کی قسم!۔" قاسم صاحب گھیل پیل ہونے لگے۔

"نہیں ہرگزنہیں......یہ تونہیں بتاؤں گی"۔حمید نے کہااورٹھیک اسی وقت فریدی نے اس کی گردن دبوچ لی۔اور ریسیوراس کے ہاتھ سے چھین کر خود سننے لگا۔اُس وقت قاسم کہہ رہا تھا "الاقسم بتادوتو میں تمہیں اپنے دل قی رانی بنالوں غا۔ بولو—ہائے بولتی رہو— کھاموش کیوں ہوگئیں"۔

"اب میں اُس نانجار کا باپ بول رہا ہوں۔" فریدی غرایا۔

"ارے باپ رے......غوپ"۔ دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

(رولانے والی)

اُردو والوں کی انگریزی دانی پرابنِ صفی کا یہ طنز دیکھئے:

"حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا "کیا تم ہماری زبان اُردو سمجھ سکتی ہو"۔

"نہیں اسی بات کا افسوس ہے۔لیکن یہاں تو سبھی انگریزی بول سکتے ہیں"۔

"ہاں۔آں۔بعض اوقات تو اپنی زبان بھی انگریزی ہی لہجے میں بولنے کی کوشش کرڈالتے ہیں"۔ (رولانے والی)

آج کے معاشرے میں عورت کی خودنمائی سے جو بے راہ روی پیدا ہوئی ہے اس پرابنِ صفی کا طنز بیحد گہرا ہے:

"حمید نے ریسیور رکھ دیا۔وہ سوچ رہا تھا......عورت......عورت......ہر طرف عورت......چہار جانب اسی کے تذکرے......لعنت ہے......اور تو......میں خود بھی......تو کیا اب میں خود اپنے ہی سر پر جوتے لگاؤں۔ ارے حد ہوگئی...... یہ بوڑھے......عورتوں کی بے راہ روی کا تذکرہ تو منہ بگاڑ کر کریں گے لیکن تفصیل کے ساتھ......رال ٹپکاتی ہوئی آنکھیں اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں جب وہ ان کی چست لباسی کا تذکرہ کرتے ہیں...... ہونٹوں میں تو تنفر آمیز کھنچاؤ ہوتا ہے لیکن آنکھیں بھیک مانگتی نظر آتی ہیں اور پھر آخر تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہوتا کہ آج کل کی عورت خودنمائی کے سلسلے میں سخت نامعقولیت کا ثبوت دے رہی ہیں"۔ (رولانے والی)

آج الیکشن لڑنے کا انداز بدل گیا ہے۔روپے کے زور پراور کرمنل ریکارڈ رکھنے والے لوگوں کے زور پرالیکشن لڑا جاتا ہے اسی لئے عام پبلک میں ڈر سمایا رہتا ہے۔ابنِ صفی نے ناول "موت کی چٹان" میں طنزیہ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے جرم وسزا کے سنسنی خیز ماحول میں بھی زندگی کے حقیقی حسن اوراس کی رعنائیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا بلکہ وہ بھٹکی ہوئی پست ذہنیتوں کوان رعنائیوں اور سچائیوں سے زیادہ سے زیادہ قریب کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ان کا شگفتہ انداز تحریران کے چبھتے ہوئے جملے اور طنز ومزاح کے نشتر کہانی کی خوبصورتی میں اوراضافہ کرتے ہیں:

"بہت زیادہ بولنے والی لڑکی کی زبان اب قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔اس

کے برخلاف دوسری لڑکی جس نے شراب پینے کی مخالفت کی تھی بالکل
خاموش تھی اور وہ حلق سے گھونٹ اتارتے وقت ایسا برا منہ بناتی تھی جیسے
کوئی مار مار کر اسے پلا رہا ہو۔

’’کیا آپ پہلی بار پی رہی ہیں‘‘۔ حمید نے پوچھا۔

’’نہیں ۔۔۔ دوسری بار ۔۔۔ مجھے بڑا ۔۔۔ خوف معلوم ہوتا ہے‘‘۔

’’واہ ڈیرسٹ‘‘۔ دوسری نے کہا ’’اس میں خوف کی کیا بات ہے‘‘۔

’’قطعی نہیں‘‘۔ حمید سر ہلا کر بولا ’’آپ الکشن تو لڑ انہیں رہی ہیں کہ کسی سے
ڈریں‘‘۔ (موت کی چٹان)

حمید کے کردار سے طنز کے فوارے ناول ’’صحرائی دیوانہ‘‘ کے دوسرے حصے میں
رنگ برنگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسے ملک میں پہنچتا ہے جس کا نام ’’طوطا چشمستان‘‘ ہے۔
یہاں کی ہر چیز نرالی، انوکھی اور حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ جس شخص سے حمید کا سامنا ہوا ہے
اس سے گفتگو ہو رہی ہے:

’’یہاں کی آبادی کتنی ہے؟‘‘۔ حمید نے پوچھا۔

’’ابھی تک گردن شماری نہیں ہو سکی‘‘۔

’’تمہاری بیوی بچے کہاں رہتے ہیں؟‘‘

’’یہ کیا ہوتے ہیں؟‘‘

’’سنو! اگر بیوی بچے بھی سمجھانے پڑے تو میں پاگل ہی ہو جاؤں گا‘‘۔ حمید
نے غصیلے لہجے میں کہا۔

’’آخر تم بات بات پر اتنے جذباتی کیوں ہو جاتے ہو؟ بتاؤ بیوی بچے کا کیا
مطلب ہوا؟‘‘

’’عورت کا تمہاری زندگی میں کیا مقام ہے؟‘‘۔

’’والدہ کہلاتی ہے‘‘۔

’’والد بھی ہوتا ہے یا نہیں‘‘۔

’’ہوتا تو ہے لیکن بس یونہی سا‘‘۔

’’اچھا جو والدہ کہلاتی ہے وہ والد کی کیا لگتی ہے؟‘‘۔

’’عقلمند‘‘۔

’’اور والد اس کا کیا کہلاتا ہے؟‘‘

’’گھامڑ کہلاتا ہے‘‘۔

’’تم لوگ بیوی اور شوہر کہتے ہو؟‘‘۔ تین سو چھیاسی نے پوچھا۔

’’ہاں، ہمارے یہاں ان کے لئے یہی نام رائج ہیں۔ اچھا جن کے وہ
والد اور والدہ ہوتے ہیں انہیں تم کیا کہتے ہو؟‘‘۔

’’طوفان بدتمیزی‘‘۔

’’بہت خوب۔ تو میں نے یہ پوچھا تھا کہ تمہاری عقلمند اور طوفان بدتمیزی
کہاں رہتے ہیں؟‘‘۔

’’ارے وہ‘‘۔ تین سو چھیاسی شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بولا ’’ابھی تو میری
مرمت ہی نہیں ہوئی‘‘۔

’’غالباً مرمت شادی کو کہتے ہوں گے‘‘۔

’’شادی کیا؟‘‘۔

’’عقلمند اور گھامڑ کے ملاپ کو کہتے ہیں‘‘۔ (صحرائی دیوانہ۔ حصہ دوم)

ابنِ صفی کا ناول ’’مونچھ مونڈنے والی‘‘ اگست ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا۔ اُس وقت
ہندوستانی اور ہالی ووڈ کی فلموں پر طنز بھرا تبصرہ دیکھئے۔ حمید سوچ رہا ہے:

’’فلموں سے تو اس کی طبیعت ہی اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہی گھسے پٹے پلاٹ،
وہی پرانی ریں ریں ٹیں ٹیں۔ ایک لڑکی اور لڑکا جن کا ایک دوسرے پر
عاشق ہو کر شادی کے لئے اُدھار کھانا ضروری! لڑکی یا لڑکے کے والدین
کی ناراضگی برحق ۔۔۔ ایک عدد ویلین کی خرمستیاں یا مست خریاں لازمی ۔۔۔
ایک بے ہنگم سے اور چند قسم کے کومیڈین کی موجودگی لابدی۔ اس پر سے

غزلوں اور گیتوں کے ردے۔۔۔ولادت اور رحلت پر ہیروئن کی غزلیں جو عموماً سیاہ لباس اور گلیسرین کے آنسوؤں کے ساتھ ہوتی ہیں قصاب کی چھری سے کم نہیں۔۔۔دیکھو تو دیکھو ورنہ ٹکٹ کے داموں سمیت جہنم میں جاؤ۔ رہ گئے ہالی ووڈ کے فلم تو ان کا کیا پوچھنا۔ ٹانگوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ پلاٹ ٹانگیں! سینریو ٹانگیں! اسکرین پلے ٹانگیں! مقصد بھی ٹانگیں ہی! اور نتیجے کے طور پر صرف یکے ٹانگے والوں کی چاندی! اور شریف قسم کے طالب علم اپنی مدد آپ کرنے کے صلے میں پیتل کی طرح زرد!''۔

(مونچھ مونڈنے والی)

ابنِ صفی کو طنز اور مزاح دونوں پر ید طولیٰ حاصل تھا۔ بات بات میں مزاح کا پہلو نکال لینا ان ہی کے حصے میں آیا تھا:

''شادی کریں گے آپ؟''۔ اس نے ہنس کر پوچھا۔

''جی ہاں! دادی کا انتقال ہوگیا''۔ حمید نے رونی صورت بنا کر کہا ''بڑی نیک تھیں بیچاری۔ مجھے پیار سے چندھر کہا کرتی تھیں۔ جس کے معنی مجھے آج تک نہ معلوم ہو سکے''۔

ہمرقص بے تحاشہ ہنس پڑی۔

''آپ کو غم ناک تذکروں پر بھی ہنسی آتی ہے''۔ حمید پھر بگڑ گیا۔

''آپ تو نہ جانے کیا الٹا سیدھا سنتے ہیں''۔ وہ بھی جھنجھلا گئی۔

''پھر کیا کہا تھا آپ نے''۔

''کچھ نہیں''۔

''کچھ تو کہا تھا! واہ یہ اچھی رہی! کیا خدا نے مجھے اس لئے بہرا کیا تھا کہ لوگ مجھے تنگ کریں''۔

''میں نے یہ کہا تھا''۔ وہ اس کے کان میں منہ لگا کر بولی ''کہ آپ رقص گاہوں میں نہ آیا کریں''۔

''کیوں؟''۔

''ورنہ کسی دن کوئی لڑکی آپ کی مرمت کردے گی''۔

''محبت کردے گی''۔ حمید نے احمقوں کی طرح کہا ''میری ایسی قسمت کہاں؟''

''جہنم میں جاؤ''۔ عورت بڑبڑائی۔

''نہیں، پہلے آپ اپنا نام بتایئے۔ میں بعد کو بتاؤں گا۔''

''کس مصیبت میں پھنس گئی''۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''خیر نہ بتایئے''۔ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''میرے بدنصیب کان اس قابل ہی نہیں ہیں کہ آپ کا پیارا پیارا سا نام سن سکیں''۔

عورت نے جھلا کر ایک جھکولا لیا اور حمید کی گرفت سے نکل گئی۔

وہ آگے جا رہی تھی اور حمید اس کے پیچھے تھا۔ گیلری میں پہنچ کر وہ ایک کرسی پر گر گئی۔

''کیا ہوا۔ کیا بات ہے''۔ حمید گھبرائے ہوئے انداز میں اس پر جھکتا ہوا بولا۔

''پیچھا چھوڑو میرا''۔ اس نے بگڑ کر کہا۔

حمید اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا طبیعت خراب ہے''۔

''نہیں! نہیں! نہیں! میرا پیچھا چھوڑ دو''۔

''سیدھا توڑ دوں''۔ حمید کھسیانے انداز میں ہنس کر بولا ''نہیں آپ مذاق کر رہی ہیں''۔

وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر تک حمید کو شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے منہ سے اس طرح کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو ''جنگلی......گنوار......احمق''۔ (مونچھ مونڈنے والی)

اسی ناول سے مزاح کا ایک اور رنگ دیکھئے جو خالص ادب سے جڑا ہوا ہے:

''اگر تم سرجنٹ حمید ہو تو میں تمہیں بہت عرصے سے چاہتی ہوں۔ تم ہمیشہ

میرے خوابوں میں رہے ہو...... میں نے تمہیں پوجا ہے"۔

"میں بھی تمہیں پوجوں گا۔ گھبراؤ نہیں"۔ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر تم بے درد اور ظالم ہو"۔ جے سیکا کے لہجے میں شکایت تھی۔

"نہیں۔ میں خواجہ میر درد ہوں۔ میرا ایک شعر سنو ۔

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

"ارے میرے ہاتھ ٹوٹے"۔ جے سیکا منمنا کر کراہی۔

"فکر مت کرو! تمہارے ٹوٹے ہاتھ بطور یادگار اپنے البم میں رکھوں گا"۔

"ارے ظالم"۔

"ظالم نہیں غالب تخلص کرتا ہوں۔ دوسرا شعر سنو ۔

کعبہ جاؤ گے اِسی منہ سے جناب غالب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

(مونچھ مونڈنے والی)

اگست ۱۹۵۴ء میں چھپے ابنِ صفی کے اِس طنز کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں طرح طرح کے بے وقوف موجود ہیں۔ حمید کہہ رہا ہے:

"آپ ٹھیک سمجھیں۔ یہ دنیا بڑی عجیب ہے۔ اکثر بڑے دلچسپ آدمیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ کل ایک صاحب سے اچانک ملنے کا اتفاق ہوا۔ دوران گفتگو رک کر مایوسی سے کہنے لگے کہ آپ بھی بیوقوف نہیں معلوم ہوتے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس جملے کا مطلب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ دنیا کا ہر پانچواں آدمی بیوقوف ہے۔ میں اب تک پانچ پانچ کی ہزاروں ٹولیوں سے تبادلۂ خیالات کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے آج تک کوئی بے وقوف نہ ملا"۔

لڑکی ہنسنے لگی "میرے خیال سے انہیں دوسرے، تیسرے اور چوتھے ہی

آدمی ملے ہوں گے"۔ (مونچھ مونڈنے والی)

ناول "نیلم کی واپسی" میں ابنِ صفی کے حیرت انگیز قلم کی کرشمہ سازیاں اپنے پورے شباب پر ہیں۔ یہ وہی نیلم ہے جو بڑے پیار سے حمید کو "بابا" اور فریدی کو "انکل" کہتی ہے۔ اس کی مسکراہٹوں کی تازگی اور شادابی اسے زندگی کا جیتا جاگتا کردار بناتی ہے۔ لیکن اس ناول میں بعض کڑوی سچائیاں بھی ہیں۔ نسلی امتیاز اور تعصب پر یہ مختصر سا اقتباس دیکھئے اور گہرے طنز کو محسوس کیجئے:

"ہم نے صدیوں تک تم سفید فاموں کے تلوے چاٹے ہیں اور آج بھی تمہارے نزدیک قابل نفرت ہیں۔ حالانکہ تمہاری یہ دولت مندی اور سرفرازی ہمارے ہی اجداد کی محنتوں کا نتیجہ ہے— چاٹو میرا انکوا— اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ"۔ (نیلم کی واپسی)

ابنِ صفی نے انسانی نفسیات کو بطون میں جا کر کھنگالا ہے اور مختلف ذہنیت کے لوگوں کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی ناول میں ایک کردار ٹوری بیڈ سٹراب عورت کے بارے میں جس طرح کی رائے رکھتا ہے اسے اس کی ذہنی کجروی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس طنز میں عورت ذات کے لئے حقارت اور کرب دونوں ہے:

"سنو سوئیٹی، تم دنیا کی دوسری عورتوں سے مختلف نہیں ہو اور عورت سگریٹ کے پیکٹ کی طرح ہمیشہ جیب میں نہیں پڑی رہتی۔ اس کی اہمیت صرف بیس سگریٹوں تک محدود ہے۔ اس کے بعد وہ جیب سے ردّی کی ٹوکری میں منتقل ہو جاتی ہے"۔

"اس بکواس کا مطلب"۔

"یہی کہ اگر تم سچ مچ میری بیوی ہوتیں تو کبھی کی ردی کی ٹوکری میں منتقل ہو چکی ہوتیں، میرے لئے عورت کی پہلی مسکراہٹ دلکش، دوسری قابل برداشت، تیسری بورنگ اور چوتھی بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی بندریا نے دانت دکھائے ہوں"۔ (نیلم کی واپسی)

ابنِ صفی کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ سماج اور معاشرے کے ہر پہلو پر ان کی نگاہ تھی۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد جمہوریت جس طرح مجروح ہوئی ہے اس پر ان کا طنز دیکھئے:

''اوہو۔ کیا تمہاری جمہوریت کا دامن اس بدنما داغ سے پاک ہے۔ کیا تمہارے یہاں ایماندار لیڈر قتل نہیں کیے جاتے۔ شہنشاہیت میں تو صرف ایک نالائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں نالائقوں کی ایک پوری ٹیم وبال جان بن جاتی ہے۔ ایک نالائق سے پیچھا چھڑانا آسان ہے لیکن پوری ٹیم سے نپٹنا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر ہمارے ملک کا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ شہنشاہ اور رعایا ہر حال میں ایک دوسرے کے پابند رہتے ہیں''۔ (بھیانک جزیرہ)

کرید، تجسس اور سنسنی خیز اس ناول میں ابنِ صفی نے ظرافت کے پھول بھی کھلائے ہیں۔ فریدی، البرونو بنا ہوا ہے۔ انور بھی ساتھ ہے، ڈی گاریکا ان سب کو ایک سازش ختم کرنے کے لئے اپنے جزیرے میں لے جا رہا ہے۔ اس کی بیٹی رمونا ساتھ میں ہے جس پر حمید فدا ہے۔ حمید کی چڑچڑاہٹ سے لطف اندوز ہونے کے لئے فریدی کہتا ہے:

''رمونا''۔ فریدی نے آواز دی۔

''کون؟''۔ رمونا چونک کر بولی ''البرونو کیا تم نے کچھ کہا''۔

''ہاں۔ کیا چائے نہیں پلاؤ گی''۔

''تم نے کب کہا تھا۔ ابھی لو''۔ رمونا اپنی جگہ پر سے ہٹتی ہوئی بولی۔ اس کے لہجے میں پیار تھا۔ حمید نے اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیئے۔

''کیا وضو کر رہے ہو؟''۔ فریدی نے اسے چھیڑا۔

''جی نہیں، آپ کے لئے چلو بھر پانی تلاش کر رہا ہوں۔'' حمید جل کر بولا۔

''تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تمہاری آنکھ کا پانی مر چکا ہے''۔ فریدی نے

کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر انور کو مخاطب کر کے بولا ''مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رمونا مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔''

حمید کچھ نہ بولا۔

''حمید تو کہہ رہا تھا کہ وہ اس پر ہزار جان سے باقاعدہ عاشق ہو گئی ہے''۔ انور نے کہا۔

''اچھا تو آپ کا بھی دماغ خراب ہوا ہے''۔ حمید پلٹ کر بولا۔

انور کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ رمونا انہیں کے قریب اسٹوپ اٹھا لائی۔

''ذرا دیکھنا تو''۔ وہ حمید کی طرف مڑ کر بولی ''اسٹوپ کام نہیں کر رہا ہے''۔

''ادھر لاؤ''۔ فریدی بولا۔

''کیا پھر اس کے دماغ کی کوئی رگ بگڑ گئی ہے؟''۔ رمونا نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں، میں نے اس سے شرط لگائی ہے۔''

''کیسی شرط''۔

''یہی کہ تم اسے چائے نہیں پیش کرو گی''۔ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیا کہتا ہے؟''

''کہتا ہے یہ ناممکن ہے''۔

''اچھا تو واقعی میں اسے چائے نہ دوں گی''۔

''شکریہ''۔ فریدی مسکرا کر بولا ''اس طرح میں جیت جاؤں گا اور پھر اس سے پندرہ پونڈ وصول کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہوگا''۔

تھوڑی دیر کے بعد حمید کو سچ مچ تاؤ آ گیا کیونکہ رمونا نے اس کی طرف توجہ تک نہ دی تھی۔ حمید کے علاوہ اور سب چائے پی رہے تھے''۔

(بھیانک جزیرہ)

ابنِ صفی کے زمانے میں معمہ کا بڑا زور تھا۔ خاص کر شمع معمہ کی دھوم تھی۔ ناول

''آوارہ شہزادہ'' میں ابنِ صفی نے حمید کی زبانی اس پر بھی طنز کیا ہے:

''مار ڈالا''۔ حمید روہانسی آواز میں بولا ''آپ نہ بولئے مگر مجھے تو بولنے دیجئے۔ ادھر کچھ دنوں سے آپ میرے لئے فلاں معمہ نمبر ۴۲۰ کا کوئی چلیپائی اشارہ بن کر رہ گئے ہیں کہ خواہ قلندر بھرو خواہ چقندر بھرو ہر حال میں ساڑھے سات غلطیاں آئیں گی۔ اور پہلا انعام ساڑھے باون ہزار خوش نصیبوں میں برابر برابر بحساب ایک آنہ تین پائی فی کس پوری پوری ایمانداری کے ساتھ تقسیم ہو جائے گا''۔ (آوارہ شہزادہ)

خواتین کی کم لباسی پر اور مغرب کی تقلید پر طنز ناول ''تصویر کا دشمن'' میں ملتا ہے۔

ابنِ صفی کی جدت پسندی ہمیشہ ایک نئے واقعہ کو جنم دیتی ہے جو انوکھا ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپیوں کے بے شمار خزانے اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اور آخیر وقت تک پڑھنے والوں کے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بناتا ہے:

''تم جیسے نامعقول باپوں نے ہی یہ باسٹرڈ سوسائٹی پیدا کی ہے۔ اپنے کلچر کی ایک چیز بھی صحیح و سلامت نہ رہنے دی۔ ابھی ابھی تم نے اپنی جگر پارہ کے جسم پر جو لباس دیکھا اور برداشت کیا تھا کیا تمہارے باپ تمہاری بہن کے جسم پر برداشت کر سکتے''۔

خاموش رہو— دقیانوس کے بچے— تم پڑھے لکھے جاہل معلوم ہوتے ہو، پھر کیوں نہ مغربی اقوام سے پیچھے رہ جاؤ''۔

''جی ہاں— اسی لنگوٹی ہی کی وجہ سے تو مغربی اقوام آگے ہیں ہم سے''۔

حمید جل کر بولا۔

''کیا مطلب؟''۔

''خواتین کی کم لباسی ہی انہیں چاند پر لے جا رہی ہے۔ سوچتے ہوں گے، جب یہ زمین کے چاند ایسے ہیں تو وہ چاند کیسا ہوگا جسے لنگوٹی بھی میسر نہیں''۔

(تصویر کا دشمن)

ابنِ صفی باخبر ادیب تھے۔ دنیا میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا تھا یا انکشاف سامنے آتا تھا اسے وہ اپنے جاسوسی ناول میں ضرور پیش کرتے تھے لیکن اس میں طنز کی چبھن ہوتی تھی۔ شیکسپیئر کے ڈرامے سے متعلق ان کا یہ تجزیہ طنز بھرا ہے:

''تم نے اس محکمے میں گھاس چھیلنے کے علاوہ آج تک اور کیا ہی کیا ہے''۔

فریدی نے کہا۔

''کیا یہ میرا عظیم ترین کارنامہ نہیں ہے کہ میری وجہ سے آپ اتنے مشہور ہوگئے۔ دنیا سمجھتی ہے کہ یہ سارے کارنامے آپ کے ہیں۔ لیکن اب سے سو سال کے بعد کوئی نہ کوئی نیک نفس اس حقیقت پر سے پردہ ضرور اٹھادے گا جس طرح شیکسپیئر کے ڈراموں کی حقیقت واضح ہوگئی ہے۔ ڈرامے لکھے بیچارے فرانس بیکن نے اور نام شیکسپیئر کا ہوا۔ اب ایک امریکن صاحبزادے نے نیا انکشاف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیکن نہیں بلکہ مارلو نے لکھے ہیں۔ اسی طرح سو سال کے بعد میرا نام ہوگا۔ اس کے بعد اللہ کا بندہ یہ ثابت کردے گا کہ فریدی کے کارنامے حمید کے نہیں بلکہ انسپکٹر جگدیش کے رہین منت ہیں''۔ (احمقوں کا چکر)

فریدی اور حمید میں ایک کیس کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ عشق اور محبت پر بات رکی تو ان دونوں کے نظریے میں ابنِ صفی کا طنز دیکھئے:

''عجیب آگ ہوتی ہے یہ بھی''۔ حمید طویل سانس لے کر بولا۔

''آدمی نے بیحد ترقی کی ہے۔ اپنے وجود سے لے کر خلاء تک کو کھنگال ڈالا ہے لیکن اس معاملے میں بچہ ہی بنا رہنا چاہتا ہے۔ ایک احمقانہ تگ و دو کو عشق کا نام دے کر اس سے لذت اندوز ہوتے رہنا چاہتا ہے حالانکہ فطرت کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ دو سے تین ہوجائے''۔

''خدارا اپنی یہ ارتھمیٹک اپنے پاس ہی رکھئے ورنہ زندگی ایک بے آب و گیاہ ریگستان بن کر رہ جائے گی''۔ (صحرائی دیوانہ۔ حصہ اوّل)

ابنِ صفی اپنے دلچسپ اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ کرداروں کی تخلیق میں بھی بے پناہ مہارت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی کا پورا ماحول زندگی سے بھرپور نظر آتا ہے۔ دلچسپ اور حیرت انگیز ایک کردار قاسم کا بھی ہے۔ ایک بار وہ اپنی کار سے باہر نکلتے وقت دروازہ میں پھنس جاتا ہے۔ حمید کہتا ہے:

''باہر نکلنے کی کوشش کرو پیارے۔ تم شاید دروازے میں پھنس گئے ہو''۔

''پھنسا رہوں گا تم سے مطلب''۔

''اچھی بات ہے تو پھر میں چلا''۔

''ٹھہر جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوغا''۔ قاسم گڑبڑا کر کسی قدر ڈھیلے لہجے میں بولا

''ٹھہرا تو بھیڑ لگ جائے گی اور سچ مچ تمہاری کمر سے رسّہ باندھنا پڑے گا۔''

قاسم نے ترچھا ہو کر پھر زور لگایا اور لڑکھڑاتا ہوا فٹ پاتھ پر ڈھیر ہو گیا۔

اب جو بوکھلا کر اٹھنے کی کوشش کی تو پیٹ کے بل ناچ کر رہ گیا۔

سچ مچ بھیڑ اکٹھا ہو گئی ان کے گرد، کیونکہ حمید انتہائی کوششوں کے باوجود اسے نہیں اٹھا پایا تھا۔ پھر کئی آدمی اس کی مدد کو آگے بڑھے اور قاسم کو کھینچ کھانچ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کے دونوں گال پھڑکنے لگے تھے۔ قریب ہی ایک لڑکی کہتی ہوئی گزر گئی ''اتنا موٹا ہے تو گھر سے کیوں نکلتا ہے''۔

بدحواسی کا دوسرا حملہ ہوا قاسم پر۔ اور وہ حمید کو جھنجھوڑ کر بولا ''چلو...... چلو...... آغے چلو''۔ (صحرائی دیوانہ۔ حصہ اوّل)

ابنِ صفی کے طنز و مزاح میں شخصیت اور معاشرہ دونوں شامل ہیں۔ انسانی فطرت کو بھی گہرے سماجی شعور کا متقاضی بنایا گیا ہے۔ یہ ان کی تحریر کی خوبی ہے کہ پڑھنے والے اکثر سوچتے ہیں، یہ مزاح ہے یا طنز ہے۔ قاسم غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ایک عورت کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا ہے:

''میں سوچ رہا تھا''۔

''کیا سوچ رہے تھے؟''

''یہی کہ مجھے سب کچھ سچ مچ آپ کو بتا دینا چاہئے''۔

''تو بتاؤ نا''۔

''میں شادی شدہ ہوں''۔

نلنی کے چہرے پر مایوسی کے آثار دکھائی دیئے۔ آنکھیں کسی قدر غمگینی کا تاثر دینے لگیں۔

''میں بڑا بدنصیب ہوں''۔ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

سچ مچ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر ڈھلک گئے۔

''اوہو — ارے — تم رو رہے ہو''۔

قاسم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر باقاعدہ طور پر سسکیاں لینی شروع کر دی تھیں۔

''تم عجیب آدمی ہو''۔ نلنی کھسیانے انداز میں بولی۔

لیکن قاسم بدستور روتا رہا۔

''میں اٹھ کر چلی جاؤں گی — کیا مجھے بھی تماشا بنانے کا ارادہ ہے؟''۔

''نن...... نہیں...... میں...... ابھی...... ٹھیک ہو جاؤں گا — آپ نہ جایئے — خدا کے لئے رک جایئے — میں آپ کو اپنی درد بھری کہانی سناؤں گا''۔

''اچھا تو اب بالکل خاموش ہو جاؤ — منہ پر سے ہاتھ ہٹاؤ''۔

بدقت تمام قاسم اپنی حالت پر قابو پا سکا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور ہونٹ کسی قدر متورم نظر آنے لگے تھے۔

''ہاں، میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''وہ میری بیوی ضرور ہے لیکن پھر بھی میری بیوی نہیں ہے''۔

"کیا مطلب؟"۔

"اب میں آپ سے کیا بتاؤں— مجھے شرم آتی ہے— مطلب یہ کہ—
بس سمجھ جائیے۔"

"آخر کیوں؟"۔

"ساڑھے چار فٹ کی ہے— اور وزن پچاس پونڈ سے زیادہ نہ ہوگا—
ایک ٹانگ ٹھیک ہے اور دوسری صرف ساڑھے آٹھ انچ کی ہے"۔

"اوہو...... پیدائشی؟"۔

"جی ہاں، پیدائش کے وقت دو ڈھائی انچ کی رہی ہوگی"۔

"مجھے بیحد افسوس ہے— لیکن تم نے اس سے شادی کیوں کی؟"۔

"بس کیا بتاؤں— ایک یتیم خانے میں چندہ دینے گیا تھا۔ یتیم خانے کے
منیجر نے کہا، اگر ثواب ہی کمانا ہے تو کسی یتیم لڑکی سے شادی کر لیجئے۔ میں
نے کہا اچھی بات ہے"۔

"بڑے احمق ہو تم"۔ نلنی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"بس کیا بتاؤں، گھپلا ہو گیا۔"

"گھپلا کیا؟"۔

"مجھے گھپلے کی انگریزی نہیں معلوم"۔

"واقعی تم بہت نیک آدمی ہو"۔

"میری ہر نیکی میرے گلے میں پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے"۔

"پھر اب تم نے کیا سوچا ہے؟"۔

"کسی دن سمندر میں کود کر جان دے دوں گا"۔

"یہ آخری اور سب سے بڑی حماقت ہوگی— تم دوسری شادی کیوں نہیں
کر لیتے؟ تم لوگ تو چار چار شادیاں کر سکتے ہو"۔

"اب نہیں کر سکتے۔ فیملی پلاننگ والوں نے گھپلا کر دیا ہے"۔ (ریگم بالا)

قاسم کے سلسلے میں اسی ناول سے ایک اور اقتباس دیکھئے:

"آخر تم اپنے باپ سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟"۔

"اس لئے کہ اسے انگریزی نہیں آتی۔ جو کچھ بھی کہتا ہے اُردو میں کہتا ہے۔
اور اُردو کی بعض گالیاں اگر پتھر پر بھی رکھ دی جائیں تو وہ ریزہ ریزہ
ہو جائے گا"۔

"گالیاں دیتا ہے تمہیں"۔

"اُردو میں"۔ قاسم ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"مجھے بھی سکھا دو اُردو کی گالیاں"۔

"ارے جاؤ— تم سے بنیں گی بھی نہیں"۔

"تم بتاؤ بھی تو"۔

"نہیں مجھے شرم آتی ہے"۔

"اب تو سکھانی ہی پڑیں گی— ورنہ دوستی ختم"۔

"ارے ارے...... نہیں اچھا۔ ایک ہلکی قسم کی گالی بتاتا ہوں۔ تم شاید ادا
بھی کر سکو— حرام زادہ"۔

"حرام زادہ— حرام زادہ— حرام زادہ"۔ وہ رٹتی رہی اور قاسم "ہی ہی
ہی" کرتا رہا۔ پھر وہ حرام زادہ کا مطلب پوچھ بیٹھی "اور اس کا محل استعمال
بھی بتاؤ"۔ نلنی نے کہا۔

"جہاں چاہو استعمال کر ڈالو۔ کوئی پابندی نہیں"۔

"قاسم حرام زادہ"۔

"دیکھو— دیکھو— یہ ٹھیک نہیں— واہ وا— مجھے ہی کہہ دیا"۔

"صوتی اعتبار سے یہ گالی مجھے اچھی لگی ہے۔ لہٰذا میں پیار سے تمہیں
حرامزادہ کہا کروں گی"۔

"اچھا— اچھا کہہ لینا— لیکن اکیلے میں"۔

"وہ اُردو نہیں سمجھتی پیارے حرامزادہ"۔

"ہی ہی ہی — نہیں۔دیکھو یہ نہیں"۔

"تو پھر حرامزادہ کے معنی بتاؤ"۔

"مجھے حرامزادہ کی انگریزی نہیں معلوم"۔ قاسم بھنا کر بولا۔

"اچھا حرامزادہ"۔ (ریگم بالا)

مجرموں نے قاسم کو نشہ آور کوئی ایسی چیز انجکٹ کردی ہے کہ اس پر بیہوشی طاری ہوجاتی ہے۔لیکن ہوش میں آنے کے بعد اس کا لڑکی بن جانا حمید کے لئے الجھن کا باعث بنتا ہے:

"قاسم کو آدھے گھنٹے سے پہلے ہی ہوش آ گیا۔اور اس نے حمید کو دیکھ کر اس طرح آنکھیں پھاڑیں جیسے وہاں حمید کی موجودگی پر اسے حیرت ہوئی ہو۔

"کیوں کیا ہوگیا تھا تمہیں۔" حمید نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"۔ قاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب"۔

"میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟"۔

"ہائیں — ہائیں"۔

"جاؤ — یہاں سے ورنہ میں شور مچادوں گی"۔ قاسم لچک کر بولا۔

"ابے کیوں شامت آئی ہے قاسم کے بچے۔ میں پوچھتا ہوں یہ کیا حرکت ہے؟"۔

"ہائے اللہ...... میرا دوپٹہ"۔ قاسم نے بدن چراتے ہوئے کہا "نکلو یہاں سے ڈھیٹ کم...... باـــ خت — اے امی جان"۔

حمید اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ قاسم میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ہنسے بغیر اس قسم کے مذاق کرسکتا اور نہ وہ اتنا اچھا اداکار ہی تھا کہ اس کی آنکھوں میں شرمیلے پن کی جھلکیاں نظر آسکیں۔

حمید اس کی سنجیدگی پر بوکھلا گیا۔کیا قاسم پاگل ہوگیا ہے۔اس نے سوچا۔یہ پاگل پن ہی ہوسکتا ہے۔اسے مذاق نہ سمجھنا چاہئے۔قاسم جیسا کوڑھ مغز آدمی عورتوں کی ایکٹنگ نہیں کرسکتا اور پھر اگر یہ مذاق ہی ہوتا تو قاسم اس کی ابتدا کرنے سے پہلے صرف سوچ کر ہی ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہوگیا ہوتا۔

"قاسم — کیا بات ہے۔آخر تم چاہتے کیا ہو؟"۔

"قاسم۔" قاسم نے حیرت سے دوہرایا۔ پھر یک بیک حلق پھاڑنے لگا

"ارے دوڑو لوگو۔ یہاں ایک پاگل گھس آیا ہے — بچاؤ...... بچاؤ — میں مری"۔

"ابے او قاسم، میں تجھے کاٹ کر رکھ دوں گا"۔

"ہائے کاٹ کر رکھ دے گا۔ دوڑو — بچاؤ"۔ قاسم پھر چیخا۔

(زمین کے بادل)

حمید اور قاسم کی چہل سے نئی تفریح سامنے آتی ہے۔ضرورتاً حمید درزی کی دکان کا مالک ہے جہاں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔حمید نے اکسایا کہ عورت کا روپ اختیار کرکے اس دکان میں نوکری کرلے۔اسے عورت بھی بنادیا اور ساڑی پہنادی۔شلوار میں الاسٹک ڈالنا وہ جلد ہی سیکھ گیا۔فریدی نے قاسم کو گھر میں اس حلیے میں دیکھا تو حمید سے باز پرس کی۔جواب میں حمید نے بتایا کہ دکان کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں کہ قاسم کو ماڈل بنایا جائے۔ایسی لحیم شحیم عورت آج تک نہ دیکھی گئی ہوگی۔غرارہ سوٹ پہنا کر عین دروازے پر کھڑا کردیا جائے گا اور اس کے ہاتھ میں بورڈ ہوگا جس پر لکھا ہوگا — "میرے ملبوسات کی فٹنگ آسان نہیں۔لیکن یہ دیکھئے"۔

اگلے دن فریدی نے قاسم پر پلاسٹک میک کردیا۔حمید خود میک اپ میں تھا اور دکان پر موجود تھا کہ قاسم ملازمت کے لئے وارد ہوا۔حیل حجت کے بعد اسے ملازمت مل گئی۔پبلسٹی کے لئے استعمال کئے جانے کی وجہ سے ایک ہفتہ کے اندر کام کا ڈھیر لگ گیا۔ایک سرخ وسپید لحیم شحیم عورت، جو ہر آنے جانے والی عورتوں کو اس طرح ندیدے پن سے

گھورتی کہ وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگتیں، دروازے کے قریب کھڑے قاسم کے جسم پر کبھی ساڑی ہوتی اور کبھی غرارہ سوٹ۔ پبلسٹی کا بورڈ اٹھائے کبھی کبھی بسورتا بھی دکھائی دیتا۔ دکان میں کام کرنے والی رضیہ سے اسے ہمدردی تھی۔ ایک دن ایک گاہک کو شکایت ہونے پر حمید اور رضیہ میں تو تو میں میں ہوگئی۔ اس کے بعد کا سچویشن ابنِ صفی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

''نہیں، اس گدھی کی بچی کی موریوں میں تو بکرم میں ہی رکھوں گی۔'' رضیہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا''اس کے بعد پھر چاہے جو انتظام ہو۔ پلاسٹک کا بکرم رکھوں گی تاکہ پریس کرتے وقت مزہ آجائے بیگم صاحبہ کو''۔

''کیا میں اُلو کا پٹھا ہوں۔'' حمید جھنجھلاہٹ میں سر سے پاؤں تک ہل کر رہ گیا۔

''میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی''۔

''میں بھی نہیں قہہ سکتی''۔ قاسم نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''لیقن اگر مجھے یہاں سے نقالا گیا تو کہنا ہی پڑے گا''۔

''شٹ اپ۔''

رضیہ نے قاسم کو اشارہ کیا کہ وہ خاموش رہے۔ بات اس کی سمجھ میں بھی آگئی اور وہ ہونٹ بھینچے ہوئے سڑک کی جانب مڑ گیا۔

اس کے بعد سناٹا چھا گیا تھا۔

حمید کچھ دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا، پھر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ دو تین کش لینے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ درزی نہیں بلکہ محکمہ سراغرسانی کا ایک ذمہ دار آفیسر ہے۔ اور چونکہ یہ کسی قسم کا ڈرامہ ہی ہے اس لئے کبھی کبھی اس قسم کا کوئی نیچرل ٹچ اسے ناگوار نہ گذرنا چاہئے۔

اس نے رضیہ کی طرف دیکھا جو مشین کے قریب سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ پائپ کے مزید دو تین کش غصے کو بالکل ہی زائل کر دینے میں موئید و معاون ثابت ہوئے۔ اور اس نے مسکرا کر کہا ''اگر تم نفسیاتی نکتۂ

نظر سے اپنے الفاظ واپس لے لو تو میں —''

''میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں''۔ رضیہ نے سر اٹھا کر کہا۔

''الاّقسم بالکل بے وقوف ہو تم''۔ قاسم بے ساختہ بول پڑا ''میں تو اپنے الفاظ واپس نہیں لوں غی۔''

حمید اسے نظر انداز کر کے بولا ''میرا خیال ہے کہ بکرم والا کام تم فرزانہ ہی کے سپرد کر دو''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ہت تیری کی''۔ قاسم نے پبلسٹی بورڈ پھینک کر اپنے زانو پر دوہتھڑ چلایا اور چند لمحے رضیہ کو گھورتے رہنے کے بعد بولا ''بہت بزدل ہو۔ الفاظ بھی واپس لئے اور اب کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔''

''ارے تم اپنا کام کرو میرے پیچھے کیوں پڑ گئیں بوا۔''

''اے جبان سنبھال کے — بوا ہو گی تم''۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم تو باؤ ہو''۔ رضیہ ہنس پڑی۔

''یہ تم نے بورڈ کیوں گرا دیا۔'' حمید نے آنکھیں نکالیں۔

''افسوس کے مارے''۔ قاسم نے سڑا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''اٹھاؤ بورڈ''۔

قاسم نے جھک کر بورڈ اٹھایا۔ لیکن بورڈ سمیت دوبارہ سیدھے ہوتے وقت توازن قاسم نہ رکھ سکا۔ چلا آیا منہ کے بل نیچے۔

آس پاس کے لوگ دوڑ پڑے۔

لڑکیاں بے تحاشہ ہنس رہی تھیں اور قاسم چنگھاڑ رہا تھا ''خبردار جو قسی نے ہاتھ لگایا — دور ہٹو — دور ہٹو — میں خدا اُٹھ جاؤں غی — غرے...... غرے باپ رِلغ —''

بدقت تمام اٹھا اور بورڈ کو ایک کنارے رکھ کر دکان کے اندر چلا آیا۔ ''اب

قسی کے منہ سے نہ پھوٹے غا کہ میں بھی ذرا سا آرام کرلوں''۔ وہ ہانپتا ہوا بولا۔۔اور ایک کرسی پر بیٹھ کر پہلے سے بھی زیادہ ہانپنے لگا۔(سہمی ہوئی لڑکی)

قاسم کی ضرورت درزی کی دکان میں اب نہیں رہی تھی اس لئے فریدی نے اسے وہاں سے ہٹوادیا۔لیکن اگلے ہی دن قاسم وہاں پہنچ گیا۔ابنِ صفی ظرافت کی پھلجھڑیاں اس طرح بکھیرتے ہیں:

''عین دروازے کے سامنے ایک ٹیکسی آکر رکی اور حمید نے دیکھا کہ قاسم دروازہ کھول کر باہر آرہا ہے۔وہ خاموش بیٹھا رہا۔

قاسم مسکین سی صورت بنائے دکان میں داخل ہوا۔لڑکیاں خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

''میں اپنا حساب واپس دینا چاہتی ہوں''۔اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب''۔

''مطلب یہ کہ میں پھر یہی نوکری قروں غی''۔

''بھاگ جاؤ''۔

''اللہ قسم۔۔رحم قرو۔۔میرے حال پر۔۔وہ سالی جوتا لگا گئی''۔

''کیوں۔کیا ہوا''رضیہ نے حیرت ظاہر کی۔

''ارے۔۔وہ حرامزادی جو آئی تھی نا،مسقرا مسقرا کر باتیں کر رہی تھی۔۔قہنے لگی میرے ساتھ چلو۔۔میرے کارخانے میں قام قرو۔۔میرے ہی ساتھ رہنا بھی۔۔میں اپنے فلیٹ میں تنہا رہتی ہوں۔بس میں نگوڑ ماری چلی گئی''۔

''نگوڑ ماری''۔ اس نے ایسے انداز میں کہا تھا کہ حمید کو ہنسی آگئی۔

''تو پھر ہوا کیا؟''۔رضیہ نے پوچھا۔

''پتہ بتایا تھا حرافہ نے لیکن وہ غلط نقلا۔نہ کارخانہ ملا۔۔اور فلیٹ میں ایک مولبی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔۔قہنے لگے یہاں کوئی دردانہ بیگم نہیں

رہتیں۔۔میں نے قہا رہتی ہیں۔۔بولے اچھی زبردستی ہے۔۔پھر آس پاس والوں نے بتایا کہ مولبی صاحب وہاں تنہا رہتے ہیں''۔

''کان نہ کھاؤ۔۔جاؤ یہاں سے''۔حمید نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''پھر رکھ لیجئے منیجر صاحب''۔قاسم گھگھیا کر بولا۔

''نہیں جاؤ''۔

''اچھا اگر میں مرد ہو جاؤں تو۔۔کپڑے کاٹنا بھی آتا ہے مجھے''۔

''مرد ہو جاؤ۔۔کیا مطلب''۔حمید نے بے انتہا حیرت ظاہر کی۔

''اور آپ کیا سمجھتے ہیں جناب کہ یہ عورت ہے''۔رضیہ نے حقارت سے کہا۔

''کیا مطلب''۔حمید اس کی طرف مڑا۔

''سچ کہتی ہوں۔۔بڑے بھولے ہیں آپ۔کسی دہقانی دوشیزہ کی طرح۔ کاش آپ کے چہرے پر داڑھی نہ ہوتی۔''

''یہ کیا مذاق ہے''۔حمید جھلا کر کھڑا ہو گیا۔

''خفا ہونے کی بات نہیں۔میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ عورت نہیں ہے۔اور اب اس نے خود ہی مرد بن جانے کا سوال اٹھایا ہے۔''

''کیوں؟''۔حمید قاسم کی طرف دیکھ کر غرایا۔

قاسم پہلے تو ''ہی ہی ہی ہی'' کرتا رہا پھر شرما کر بولا''اللہ قسم میں عورت نہیں ہوں۔۔یہاں نوقری کرنے کے لئے ہی ہی ہی ہی۔''

''ہوں۔۔اچھا۔۔میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔تم لوگ دیکھتی رہو بھاگ کر جانے نہ پائے''۔حمید دوسرے کمرے کی طرف جھپٹا۔۔اور قاسم بدحواسی میں دکان سے اتر کر سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔''

(سہمی ہوئی لڑکی)

ابنِ صفی کا ناول ''دیو پیکر درندہ'' اپنی کہانی اور کردار کے انوکھے پن کی وجہ سے ایک شاہکار ہے۔ان کا ہمیشہ یہ انداز رہا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں یا ناولوں میں کچھ ایسے انوکھے

واقعات و کردار ضرور پیش کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے ذہن پر لافانی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔جسم و ذہن کی تبدیلی مجرموں کی ایک بھیانک اور انوکھی ایجاد ہے۔اس ناول میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کا ایسا سائنسی کرشمہ ملتا ہے جسے دیکھ کر قاسم بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ تحیر، ہنسی اور انوکھے واقعات سے بھرپور اس ناول میں ایک موقع ایسا آتا ہے جب قاسم یہ سمجھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے، قبر میں ہے اور عذاب قبر سے بچنا چاہتا ہے۔ہنسی اور طنز ملاحظہ کیجئے:

''نیم بیدار ذہن پر عذاب قبر کا خوف مسلط تھا، سہا ہوا تھا کہ نکیرین پتہ نہیں کس قسم کے سوالات کریں۔ پھر یک بیک وہ بڑبڑانے لگا ''ارے باپ رے۔ مجھے عربی تو آتی ہی نہیں۔اے فرشتوں بھائیوں، اُردو میں پوچھنا جو کچھ پوچھنا ہو۔ الاقسم میں بالکل بے گناہ ہوں۔ یہ سالے اِدھر اُدھر والے بہکا دیتے تھے''۔

اتنے میں کہیں سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور وہ گڑگڑانے لگا ''آگئے، — آگئے—ہائے قبر میں بھی گھنٹی لگی ہوتی ہے— آجائیے قون صاحب ہیں جناب''۔

کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا—اور قاسم آنکھیں کھولے بغیر گھگھیاتا رہا ''حضور عالی—جناب والا— میرا رب وہی ہے جو آپ کا ہے— مگر میں سالا بڑا گنہگار ہوں—مافی دلوا دیجئے—الاقسم پھر جو کبھی کسی کے بہکانے میں آؤں—''۔

''اٹھو کیا بکواس لگا رکھی ہے''۔ایک بڑی سریلی آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی اور آنکھیں کھولے بغیر دونوں ہاتھوں سے کلیجہ دبا کر کراہا

''ہائے تم بھی عورت بن کر آئے ہو—اب میں قیا کروں''۔

''یہ اس طرح آنکھیں نہ کھولے گا''۔نسوانی آواز پھر سنائی دی ''اس پر ایک بالٹی پانی الٹ دو''۔

''ہائیں تو کیا الاّمیاں کے یہاں بھی بالٹی ہوتی ہے''۔قاسم نے کہا اور

مارے حیرت کے نہ صرف اٹھ کر بیٹھ گیا بلکہ آنکھیں بھی کھول دیں۔!بس ذہنی رو بہک گئی تھی۔

سامنے ایک خاصے تن و توش والی عورت کھڑی نظر آئی۔عمر زیادہ سے زیادہ چھبیس ستائیس سال رہی ہوگی۔جین اور جیکٹ میں ملبوس تھی۔قاسم اسے دیکھ کر منہ چلانے لگا۔پھر جلدی سے دونوں گال پیٹ کر رکھ دیئے۔

''یاالا—توبہ—توبہ—ارے توبہ—توبہ''۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''۔عورت نے پوچھا۔

قاسم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''الا معاف کرے''۔

''منہ کیوں پیٹ رہے ہو؟''۔

''کیسے فرشتے ہو—پتہ لگاؤ''۔

''فرشتے......؟''۔

''عورت بن کر کیسے آئے ہو؟ میرا امتحان لینے''۔

''تم ہوش میں ہو یا نہیں؟''۔

''میں بہت اچھا آدمی ہوں—بس کبھی کبھی بہک جاتا ہوں''۔

''کیا بک رہے ہو؟''۔

''اچھا لو امتحان—دیکھو کتنا شریف آدمی ہوں—تم ایسی پتلون پہنے ہوئے ہو، پھر بھی میں کھاموش ہوں''۔

''ہوش کی باتیں کرو ورنہ الٹے لٹکا دیئے جاؤ گے''۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا—کہ دیکھو—میں کتنا شریف آدمی ہوں۔ ہی ہی ہی ہی—''۔

''کہیں یہ تو نہیں سمجھ رہا ہے کہ یہ مر گیا ہے''۔پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے کہا۔

''تو قیا نہیں مر گیا''۔قاسم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسے۔

"اے خدا کے لئے مجھے بہکاؤ نہیں۔ تم دونوں منکر نکیر ہو۔ بھیس بدل کر
آئے ہو میرا امتحان لینے۔ الاقسم میں تو عورتوں سے دور بھاگتا ہوں۔ وہ
سالا حمید اکثر مجھے پھنسوا دیتا ہے"۔ (دیو پیکر درندہ)

ناول "موروثی ہوس" میں ایک نئی دنیا کی سیر ہے۔ اس میں قاسم خود دلچسپی اور
قہقہوں کی ایک دنیا نظر آتا ہے۔ اس کی مضحکہ خیز حرکتیں سراغرسی کی سنگلاخ وادیوں میں ہنسی
اور مسکراہٹوں کے بے شمار پھول کھلاتی ہیں:

"حمید خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اندازہ تھا کہ شام ہونے سے قبل ہی وادیٔ
سرخاب میں داخل ہو جائیں گے۔
"یہ تو بہت برا ہوا"۔ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔
"قیا ہوا"۔ قاسم چونک کر بولا۔ وہ اس کے برابر ہی بیٹھا ہچکولے کھا رہا تھا۔
"آسمان کی طرف دیکھو"۔
"ہاں — ہاں — موسم سہانا ہو غیا ہے"۔ قاسم خوش ہو کر بولا۔
"اس وہم میں نہ رہنا — پہاڑی سڑک ہے۔"
"ہو خی ...... سسٹر ان لا"۔
"کیا مطلب — سسٹر ان لا"
"ہی ہی ہی — قچھ نہیں — وہ آج کل ذرا اونچی سوسائٹیوں میں اٹھ بیٹھ
رہا ہوں —— نا — اے لانت ہے۔"
نہ جانے کیوں اسے یک بیک غصہ آ گیا۔ ورنہ بات تو "ہی ہی ہی ہی"
سے شروع ہوئی تھی۔
"ہوش میں تو ہو ——"۔
"بالقل ...... دراصل کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی ......"۔
"تو کیا پھر کسی سسٹر ان لا کا چکر ہے۔"
"اے نہیں۔ وہ چپاتی بیغم .... خدا غارت کرے۔"

"آہا تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خود ساتھ نہیں ہوتیں تو خیال سر پر سوار رہتا ہے۔"
"یہ بھی نہیں۔ اسی تی وجہ سے اونچی سوسائٹیوں میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔
اور وہ مجھے ایٹی کیٹ سکھاتی ہے۔ ہات تیری ایٹی کیٹ کی"۔
ایٹی کیٹ کو بھی چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہو گا ایسی کریہہ گالی نکلی تھی قاسم کے
حلق سے۔
"ابے دماغ تو نہیں خراب ہو گیا — گوبر انڈیل دیا ہے میرے کانوں میں"۔
"قیا قروں — کہتی ہے بات بات پر سالا سالی نہ قہا قرو"۔
"اچھا — اچھا — ظاہر ہے شریفوں میں بیٹھ کر شرفاء ہی کی زبان بولنی پڑتی ہے"۔
اس پر قاسم نے "شرفا" کی بھی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دی تھی۔
"اے کیا ہو گیا ہے تم کو ......"۔
"سسٹر ان لا ...... اور برادر ان لا ......"۔ (موروثی ہوس)

اسی ناول میں ایک ایسا جوتا ملتا ہے جسے قاسم اکبر اعظم یا جہانگیر کا جوتا شریف کہتا
ہے۔ اس جوتا سے متعلق قاسم کی زبانی یہ طنز دیکھئے:

"جوتا فرش پر رکھا ہوا تھا اور وہ تینوں اسے خاموشی سے دیکھے جا رہے تھے۔
"قق ...... قیا اب یہ اڑے گا بھی"۔ اس نے ہنسی پر قابو پانے کی کوشش
کرتے ہوئے پوچھا تھا — اور پھر شاہدہ بھی ہنس پڑی تھی۔
ماں نے سخت لہجے میں کہا "اسے سوٹ کیس میں ڈال دو"۔
"اس جوتے قو"۔ قاسم کے لہجے میں حیرت تھی۔
"ہاں قاسم صاحب، مجھے نوادرات اکٹھے کرنے کا شوق ہے۔ یہ جوتا
پندرہویں صدی کا معلوم ہوتا ہے"۔
"جرور ...... جرور ...... لیکن ایک ہی تو ہے۔ پتہ نہیں پندرہویں صدی سے
ادھر کیوں آ نکلا تھا کہ بیچارے قو ایک جوتا چھوڑ کر بھاگنا پڑا ......"۔
(موروثی ہوس)

ابنِ صفی نے قاسم کی شخصیت کی نفسیاتی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ذہنی پیچیدگی کو تو پیش کیا ہی ہے ساتھ ہی مزاح کی گنجائش بھی نکالی ہے:

"تم طرفداری کیوں کر رہی ہو"۔

"زخمی ہیں اور ہمدرد آدمی ہیں"۔

"خدا کرے میں بھی زخمی ہو جاؤں"۔

"سچ کہتی ہوں۔ تمہاری ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اس کی سب سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میں قہتا ہوں پچھتاؤ گی"۔

وہ جھلا کر آگے بڑھی اور خود ہی اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر قاسم بے چین ہو کر بولا "ارے...... ارے...... جرورت ہی قیا ہے۔ یہیں آگ جلا دو"۔

"کھلے میں آگ جلائی تو گولیوں سے چھلنی ہو کر رہ جائیں گے۔"

"بڑی مشکل ہے"۔ قاسم نے کہا اور اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔

"اب تو اٹھ جاؤ سالے۔" وہ دانت پر دانت جما کر آہستہ سے بولا "اب تو ارمان پورا ہو گیا"۔

"کیا ئیں...... ہائیں......"۔ حمید منمنایا تھا لیکن زلیخا نے اسے سیدھا کھڑا کیا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے شانوں پر رکھ کر اور کمر میں ہاتھ دے کر درّے کی طرف لے چلی۔ وہ پوری طرح ہوشیار نہیں تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی جسم جھولا جا رہا تھا۔

قاسم دھپ سے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا"۔

(موروثی ہوس)

قاسم اپنی بیوی کو چپاتی کہتا ہے لیکن اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ حمید یا کوئی بھی اس کا ذکر نکالے۔ خاص کر جب وہ کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ ہو۔ دراصل وہ خود کو شادی شدہ ہونا

ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ حمید اس کی اس کمزوری سے اکثر لطف اندوز ہوتا ہے:

"تم مت بولو۔ تم سے بات نہیں قر رہا"۔

"چچ...... چچ...... چپاتی"۔

"ارے ہی ہی ہی......" قاسم زور سے ہنس پڑا۔ اور بولا "میں تو مذاق قر رہا تھا"۔

"کیا بات ہوئی — چچ — چچ — چپاتی"۔ زلیخا نے حیرت سے کہا۔

"قچھ نہیں"۔ قاسم شور مچانے والے انداز میں بولا "بھوک لگ رہی ہے حمید بھائی کو"۔

"بھائی بھی ہو گئے"

"بہت پرانا بھائی ہے۔ قیوں حمید بھائی"۔

"اور کیا۔ جب یہ بہت زیادہ بولنے لگتا ہے تو میں اس کے منہ پر چپاتی باندھ دیتا ہوں۔"

"اب بس ختم قرو"۔ قاسم ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔" زلیخا نے سر ہلا کر کہا۔

"چپاتی کبھی نہیں کھائی جاتی ہے۔ اگر کسی خاتون کا نام چپاتی بیگم ہو تو کیسی رہے گی"۔ حمید بولا۔

"تمہاری دُم رہے گی۔ اللہ قسم رائفل ہے میرے ہاتھ میں"۔

(موروثی ہوس)

ابنِ صفی نے قاسم کے کردار میں سادہ لوحی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ یہ بے ضرر شخص تفریح کے سامان مہیا کرتا ہے۔ اس کی نفسیات الگ ہے۔ سماجی مسائل، اور زندگی کے تلخ وشیریں حقائق کی تمام تہوں اور سطحوں پر نظر رکھتے ہوئے قاری کو سادہ انداز بیان میں ابنِ صفی وہ سب کچھ دیتے ہیں جس سے شگفتہ نگاری کو درجۂ اعتبار ملتا ہے:

"خدا تمہیں غارت کرے"۔ قاسم اسے مکا دکھا کر بولا۔

"میں نے کیا کیا ہے"۔اس کی بیوی ہنس پڑی۔

"تم نے کیوں مخاطب کیا مجھے۔ جب جانتی تھیں کہ میرے منہ میں پیک ہے"۔

"تم تھوک کر بولے ہوتے"۔

"کیوں تھوک کر بولا ہوتا۔تم مجھ سے بولی ہی کیوں"۔

"واہ یہ اچھی رہی۔گندے کہیں کے"۔

"کیا کہا۔میں گندہ ہوں"۔قاسم حلق پھاڑ کر چیخا۔

"نہیں۔بڑے صفائی پسند ہیں۔قمیض برباد کرلی"۔

"تم سے مطلب؟ میری قمیض ہے یا تم اپنے باوا کے گھر سے لائی تھیں"۔

"دیکھئے باپ دادا نہ چڑھیئے گا ورنہ اچھا نہ ہوگا"۔وہ بھی تیز ہوگئی۔

"کیا نہ اچھا ہوگا— چڑھوں گا باپ دادا۔تمہارے باپ تمہارے دادا۔سو دفعہ تمہارے باپ دادا بلکہ ان کے بھی دادا کے دادا"۔

"دیکھتی ہوں اب کیسے گھر میں پان آتا ہے"۔

"دیکھتا ہوں کون روکے گا، پان ہی نہیں......اب تو برانڈی کی بوتلیں ہی آئیں گی"۔

"چچا جان کا ہنٹر شاید بھول گئے"۔ (موت کی چٹان)

ابنِ صفی، قاری کو جیتی جاگتی ایسی فضا میں لے جاتے ہیں جہاں قاسم کی شخصیت کشش رکھتی ہے اور منظر زندہ اور متحرک نظر آتا ہے:

"یہ کیا ہے؟"۔رشیدہ نے پوچھا۔

"گوبھی کے تازہ پھول"۔قاسم نے سعادتمندی سے کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے"۔رشیدہ جھنجھلا گئی "کل بھی تم نے یہی حرکت کی تھی مگر میں ہنس کر ٹال گئی تھی"۔

"تو کیا وہ پھول باسی تھے" قاسم نے پوچھا۔

"آخر یہ ہے کیا بدتمیزی۔اور آج تم انہیں یہاں سب کے سامنے اٹھا لائے"۔

"کمرے میں پہنچا دوں"۔قاسم نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"میں کہیں تمہارے سر پر چائے دانی نہ توڑ دوں"۔رشیدہ آپے سے باہر ہوگئی۔

"مجھے تو معلوم ہوا تھا کہ تمہیں گوبھی کے پھول پسند ہیں"۔قاسم رونی شکل بنا کر بولا۔

"کس گدھے نے کہا تھا"۔

"حمید بھائی نے؟"

"اوہ۔" رشیدہ خاموش ہوگئی۔ پھر ہنسنے لگی اور اس نے کہا "آخر اتنے بیوقوف کیوں ہو؟"۔

"اس میں بیوقوفی کی کیا بات"۔قاسم برا مان گیا "تم کبھی کچھ کہتی ہو کبھی کچھ۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ میں بالکل بیوقوف نہیں ہوں۔اور اب بیوقوف ہوں"۔

رشیدہ کی ہنسی تیز ہوگئی۔ (موت کی چٹان)

ایڈونچر،سراغرسی اور سائنسی کارناموں سے بھرپور ناول "طوفان کا اغوا" بھی ہے۔ ابنِ صفی کی اپج اور خلاق طبیعت کا نمونہ اس میں خوب ملتا ہے۔سائنس کے اکتشافات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس میں بہت مواد ہے۔قاسم اپنی تمام تر حماقتوں کے ساتھ "جلوہ افروز" ہے۔اس کی مضحکہ خیز شخصیت سیلاب تبسم بن کر اٹھتی ہے اور دیوار قہقہہ بن جاتی ہے:

"حمید کو بے ساختہ ہنسی آگئی کیوں کہ قاسم گھونسہ دکھانے کے ساتھ ہی طرح طرح کے منہ بنا کر آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔

حمید کو ہنستے دیکھ کر فریدی بھی مڑا۔قاسم بوکھلا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں گھونسہ اٹھا رہ گیا۔آنکھیں بند ہوگئیں اور زبان نکل پڑی۔

"یہ کیا ہوگیا ہے اسے"۔فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔

'' کچھ نہیں۔ اس کی شامت آنے والی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آج رات کو اسے پلا کر کسی نائٹ کلب میں چھوڑ آؤں۔ پھر دوسرے دن صبح آپ وہاں جا کر اس کی لاش کا مطالبہ کر سکتے ہیں''۔

دوسرے ہی لمحے میں قاسم دھڑ دھڑاتا ہوا اندر چلا آیا۔ '' تم غارت ہو جاؤ گے''۔ وہ حمید کی طرف انگلی اٹھا کر دہاڑا '' اللہ نے چاہا تو کیڑے پڑیں گے۔ دھواں اٹھے گا تمہاری قبر سے''۔

'' کیا لغویت پھیلائی ہے''۔ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

'' آپ نہ بولئے۔ وہ سالی مجھ کو کہتی ہے ۔۔ ہلو ماموں جان۔ ہلو ماموں جان۔''

'' کیا بک رہے ہو''۔ فریدی بگڑ گیا۔

'' اپنی کسی بھانجی کو سالی کہہ رہا ہے''۔ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

'' تم خود...... بھانجی...... اغ...... الو ۔۔ کی بھانجی...... سس۔ مرو ۔۔ اچھا نکلنا باہر'' قاسم آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ عقل کھوپڑی کے اوپر لہرا رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا غصے کی زیادتی کی وجہ سے نہ کہہ سکا اور حمید کو گھونسا دکھاتا ہوا باہر چلا گیا۔

'' بھئی، میں تم سے عاجز آ گیا ہوں''۔ فریدی ٹھنڈی سانس لے کر بولا '' تمہارے ملنے والے بھی میرے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ آخر یہ کیا بک رہا تھا''۔

'' ارے...... وہ کچھ نہیں''۔ حمید ہنس پڑا۔ پھر بولا '' پچھلی رات ایک یوریشین لڑکی سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ نام ماموں جان بتایا۔ اس وقت یہ الّو کا پٹھا ہی ہی کر رہا تھا''۔

'' میں سب سن رہا ہوں''۔ راہداری سے آواز آئی اور پھر قاسم سامنے آ کر بولا '' تم خود الو کے پٹھے۔ تمہاری سات پشتیں الو کی پٹھیاں ۔۔ اب تم باہر

نکلو۔ تمہاری چٹنی نہ بنائی تو کچھ نہ کیا''۔

فریدی ہنسنے لگا۔ حمید تو پہلے سے ہنس رہا تھا''   (طوفان کا اغوا)

قاسم کو حمید اظہار محبت کرنے کا طریقہ بتاتا ہے:

'' بھئی بات دراصل یہ ہے کہ تم بالکل پہاڑ خاں ہو اس لئے وہ تم سے ڈرتی بھی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں کس طرح اس سے اظہار محبت کروں۔ اگر وہ خفا ہو گیا تو''۔

'' ارے ۔۔ واہ ۔۔ الاقسم ۔۔ وہ کر کے بھی تو دیکھیں اظہار محوبت...... میں بالکل کھفا نہیں ہوں گا''۔

'' اچھی بات ہے۔ اب میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا دوں گا۔ مگر یار تم خود ہی کیوں نہیں کرتے اظہار محبت۔ وہ خوشی سے مر جائے گی۔''

'' تم خود مر جاؤ''۔

'' ارے بڑے بھائی یہ محاورہ ہے۔ خوشی سے مرجانا۔ مطلب یہ کہ شادیٔ مرگ''۔

'' شادی بھی کر لے گی۔'' قاسم خوش ہو کر بولا۔

'' نہیں شادی تو شاید نہ کرے کیونکہ شادی وہ کسی ایسے آدمی سے کرنا چاہتی ہے جس کی پہلی بیوی ابھی زندہ ہو۔''

'' الاقسم، میری پہلی بیوی ابھی زندہ ہے''۔ قاسم لہک کر بولا۔

'' تب تو تمہاری چاندی ہی چاندی ہے۔ وہ تیار ہو جائے گی۔''

'' پھر میں کیسے ۔۔ اظہار محوبت کروں۔''

'' آؤ۔ اندر بیٹھو۔ اطمینان سے گفتگو ہو گی۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ تم خواہ مخواہ میری طرف سے بدگمان ہو گئے ہو۔''

(طوفان کا اغوا)

قاسم کو حمید بتاتا ہے کہ اظہار محبت کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ تنہائی ہو۔ چاندنی رات اور دریا کا کنارا ہو تو کیا کہنا۔ یہاں یہ دونوں آسانیاں نصیب ہو سکیں گی۔

مثلاً چاندنی رات ہے اور یہ سامنے جھیل ہے۔ اسے جھیل کے کنارے لے جا کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہنا۔ پھر دبی زبان سے کہہ دینا کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے:

''وہ دیکھئے — مطلب یہ کہ اِدھر کی بات یہ ہے — یہ جھیل ہے نا — یہ چاند ہے نا — اور ادھر کی بات...... یا...... خدا...... خدا جانے — اُدھر کی بات یعنی اِدھر اُدھر کی باتیں۔''

''کیا آپ نشے میں ہیں۔'' نیلم نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

''قسم لے لیجئے جو آج تک شراب چکھی بھی ہو۔''

''پھر افیون یا چانڈو سے شوق کرتے ہوں گے''۔

''ارے توبہ توبہ۔'' قاسم زور زور سے اپنے گالوں پر تھپڑ مارنے لگا۔

''آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔'' نیلم نے غصیلی آواز میں کہا۔

''ارے بھائی صاحب۔'' قاسم نے بوکھلا کر شائد حمید کو آواز دی اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ بند کر کے ہکلانے لگا۔

''دیکھئے — اِدھر — اُدھر کی باتیں تو کر چکا — اب دیکھئے — چاندنی کے کنارے جھیل ہو گیا ہے''۔

''آپ آدمی ہیں یا ہونق۔''

''جی ہاں...... آدمی...... نہیں ہونق...... مم مگر...... ہونق کسے کہتے ہیں۔''

''آئینے میں شکل دیکھتے وقت سوچا کرو کہ ہونق کسے کہتے ہیں۔''

''بہت بہتر۔ اب سوچا کروں گا۔'' قاسم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اسے دراصل حمید کی دوسری ہدایت یاد آ گئی تھی۔ یعنی دبی زبان سے اظہار محبت کرنا۔

دبی زبان سے کیسے؟ اس نے سوچا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے میں دانتوں تلے زبان دبا کر بولا ''مسی آپ سے مجّغ ہے۔''

''کیا — میں نہیں سمجھی۔''

''آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔'' قاسم نے

زبان کو دانتوں کے دباؤ سے آزاد کر کے کہا۔

''کیا کہا تھا ابھی آپ نے۔''

''جو کچھ کہا تھا دبی زبان سے کہا تھا...... جی ہاں...... جی ہاں...... اور آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ میری ایک بیوی ابھی زندہ ہے۔''

نیلم دو چار قدم پیچھے ہٹی۔ اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر بولی ''بتاؤ مجھے یہاں کیوں لائے تھے ورنہ سر کے بیس ٹکڑے کر دوں گی۔''

''ارے باپ رے۔'' قاسم بوکھلا کر پیچھے ہٹا اور پھر بڑی دردناک آواز میں کراہا ''اے — پیارے بھائی۔''

''بتاؤ جلدی۔'' نیلم غرائی۔

''بب — بتاتا ہوں — اظہار محبت — جی ہاں۔''

''اوہ۔'' نیلم ہونٹ سکوڑ کر بولی ''اچھا — زمین پر اوندھے لیٹ جاؤ۔ میں بھی اظہار محبت کروں گی۔''

قاسم کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں۔ پتہ نہیں یہ خوشی کا اظہار تھا یا حیرت کا۔ لیکن اس نے حکم کی تعمیل میں دیر نہ لگائی۔ جیسے ہی وہ لیٹا نیلم اچھل کر اس پر کھڑی ہو گئی۔

''ارے — ہائیں۔'' قاسم کراہا۔

''پڑے رہو چپ چاپ تم کیسے الو کے پٹھے عاشق ہو۔''

پھر وہ باقاعدہ طور پر اس پر کودنے اچھلنے لگی۔

''ارے...... ارے...... اترو...... ہائیں۔''

''میں اسی طرح محبت کرتی ہوں۔ چپ چاپ پڑے رہو۔''

(طوفان کا اغوا)

ابنِ صفی کا ناول ''دہشت گر'' اپنے دامن میں دلچسپیوں کی ایک نئی فضا لئے ہوئے ہے اور سراغرسی کی سنگلاخ وادیوں میں ظرافت کے رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں جس کی وجہ

سے پورا ماحول نہایت ہی دلکش نظر آتا ہے۔تحیر اور استعجاب سے بھر پور اس ناول میں گرانڈیل قاسم کی مضحکہ خیزیاں قہقہوں کا ایک سیلاب لاتی ہیں۔ایک بار پھر وہ ہپّی کی شکل میں اپنی بوکھلاہٹوں کے نئے شگوفے چھوڑتا ہے:

''بالآخر قاسم گھر ہی سے نکل بھاگا۔بیوی نے زندگی تلخ کر رکھی تھی۔وجہ تھی قاسم کی داڑھی۔پچھلے دنوں سے وہ داڑھی بڑھانے کے خبط میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔سر کے بال تو پہلے ہی سے کاندھوں تک پہنچے ہوئے تھے۔لیکن وہ اسے جدید فیشن کے مطابق سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔لیکن جب قاسم نے شیو کرنا بھی ترک کر دیا تو ایک دن جھلا کر بولی ''کیا اب میرے دادا جان بنو گے؟۔''

''اپنا بھی بنوں غا'' قاسم نے خوش ہو کر کہا۔

''میں کہتی ہوں اگر تم نے شیو نہ کیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''قیا اچھا نہ ہوگا'' قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

''بالکل جنگلی معلوم ہونے لگے ہو۔''

''میں پوچھ رہا ہوں قیا اچھا نہ ہوگا۔''

''میں کہیں چلی جاؤں گی؟''

''کب؟'' قاسم نے بہت زیادہ خوش ہو کر پوچھا۔

''تم تو چاہتے یہی ہو۔''

''قیوں نہ چاہوں۔کس کام کی ہو۔''

''باوا جان سے پوچھو جا کر۔''

''وہ بہت بھولے بھالے ہیں۔شرما قر جوتا اتار لیں گے۔''

(دہشت گر)

قاسم گھر سے بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ایک ہوٹل میں قیام ہے۔اس نے فون پر حمید کو اطلاع دی کہ گیٹار خرید لیا ہے۔حمید کے جواب میں طنز کی کاٹ ہے:

''اکیلے مجھے شرم آتی ہے۔گھبرا قر ایک گیٹار خرید لیا ہے۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔اب آرام سے بیٹھو اور گیٹار پر زوزوزوزوزوزو۔ میرا محبوب ہے تو، بجانے کی کوشش کرو۔''

''ابے ہاں، یہ زوزوزوزوقیا ہے۔''

''کتے کو چک چک چک کر کے بلاتے ہیں نا— اسی طرح محبوب کو بلانے کے لئے زوزوزوزو کرتے ہیں۔''

''ابے نہیں۔''

''ہاں—ہاں—ورنہ یہ گانا اتنا مقبول کیوں ہوتا۔''

''میں نے تو نہیں دیکھا کسی کو زوزوزوزو کرتے۔''

''تم نے ابھی محبوب ہی کہاں دیکھا ہے۔''

''اکیلے مجھ سے گیٹار بھی نہیں بجے غا۔''

''اسی لئے جورو نے گھر سے نکال دیا ہے۔''

''ابے جبان سنبھال کے۔میں خود نقلا ہوں۔'' (دہشت گر)

ابنِ صفی نے طنز کے لئے بعض الفاظ سے صوتی جمالیات اس طرح کشید کی ہے کہ معنوی اور فکری خیال، علامت اور استعارہ بن جاتا ہے:

''قیا مطلب۔'' قاسم نے آنکھیں نکالیں اور پھر یک بیک چونک کر بولا

''ہاں یہ تم نے پاسپورٹ پر میرا نام قو خاں کیوں لکھوایا ہے؟۔''

''اور پھر کیا لکھواتا۔''

''کیا میں تمہیں قو لگتا ہوں۔''

''تم تو قو کے بھی قو قو لگتے ہو۔''

''ابے تم خود قو قو بلکہ تی تی۔''

''میری فکر نہ کرو۔''

''تم آخر ہو قون؟۔''

"قراقاخاں۔"

"سب سالے قاف ہی سے ہیں تو پھر لونڈیا کا نام قلفی قیوں نہیں رکھ دیا تھا۔"

"قلفی سے بھی زیادہ ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے۔"

"سب تمہاری بے وقوفی سے ہوا ہے۔ سالی یا تو پڑھتی رہتی ہے یا اوٹ پٹانگ باتیں قرتی ہے۔ ہونہہ نروان۔۔۔ مگر یار یہ نروان ہوتا قیا ہے۔"

"ہندی کا لفظ ہے۔ بمعنی نجات۔

"کس سے نجات......"

"ہوگی کسی سے۔ میں نہیں جانتا لیکن جسے تم مل جاؤ اس کی ہوگئی نجات۔"

"قیا مطلب۔"

"حمید صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہاری بیوی کی بھی نجات ہوگئی ہے۔"

"خبردار جو میری بیوی کا نام لیا۔ گدی سے زبان کھینچ لوں گا اور حمید کی تو۔"

اتنی خوفناک گالی تھی کہ حمید کو پسینہ آ گیا لیکن کیا کرتا۔ سنی ہی پڑی کیونکہ قراقاخان تھا۔ پھر بھی دبی زبان سے کہا "اتنے اچھے دوست کو اس طرح ذلیل نہ کرو۔"

"اور وہ سالا میری بیوی کی نجات کراتا پھرے۔" قاسم آپے سے باہر ہوا جارہا تھا۔

(دہشت گر)

ابنِ صفی نے نروان کو دوسرے طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لئے قاسم کا کردار ہے جو مجسم تفریح ہے:

"وہ پلکیں جھکائے بغیر قاسم کو دیکھے جا رہی تھی۔ اور قاسم اس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ دفعتہً سکی نے کہا "تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتے۔"

"آئیں۔۔۔ہاں۔" قاسم چونک پڑا اور پھر "ہی ہی ہی ہی" اسٹارٹ ہوگئی اور اس میں اچانک بریک بھی لگ گیا۔ شاید خود ہی اس مضحکہ خیزی کی

طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"یہ سب کیا کرتے رہتے ہو" سکی نے حیرت سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔" قاسم جھینپ کر بولا "تم اپنی کتاب پڑھونا۔"

"نہیں اب میں صرف تمہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"چرس پیئو۔" قاسم نے یونہی ہانک دی۔

"ترک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم بھی تو نہیں پیتے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"تمہارے ساتھی کی باتیں میری سمجھ میں آگئی ہیں۔ واقعی میں اب تک غلط راہ پر چلتی رہی ہوں، میں کیسے نروان حاصل کر سکتی ہوں جبکہ چرس نہ ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ نہیں ملتی تو اذیت میں مبتلا رہتی ہوں۔ اور یہ بلا میں نے ہی تو اپنے گلے لگائی ہے۔ چرس وقتی طور پر دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ دکھوں سے مستقل طور پر نجات نہیں دلا دیتی۔۔۔ جوگیوں اور سادھوؤں کے افکار نے مجھے بہکا دیا تھا۔ تمہارے ساتھی نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دکھوں سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب سارے انسان اپنے دکھ آپس میں بانٹ لیں۔ صرف یہی ہے نجات کا راستہ۔"

"وہ تو پاگل ہے۔ بکواس کرتا ہے۔ تم خوب چرس پیئو۔ چاہے جتنی مہنگی ملے۔ میں تمہیں پلاؤں گا۔"

"آخر کیوں؟۔"

"ارے انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہے۔ اور کسی کام نہیں آ سکتا تو چرس ہی پلاؤں غریبوں محتاجوں کو۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ جتنا وہ عقلمند ہے اتنے ہی تم گھامڑ ہو۔"

"جو جی چاہے کہو۔ میں تو مرتے دم تک تمہیں چرس پلاتا رہوں گا۔ تمہیں چرس پینے کی ملازمت دیدوں گا اپنے دفتر میں۔"

"ملازمت؟۔"

"ہاں ہاں۔ سکریٹری فار چرسنگ۔ تنخواہ الگ۔ چرس مفت۔"

"ہنسی آجائے گی مجھے۔"

"آجانے دو۔ میں نے تہیہ کرلیا ہے۔"

"کیا میں تمہیں اتنی اچھی لگتی ہوں۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" قاسم نے کہا اور دل میں بولا "سالی مونگ کی دال۔ نہ ہنستی ہے نہ مسکراتی ہے۔" (دہشت گر)

ابنِ صفی کا ایک کردار عمران بھی ہے۔ وہ حماقت انگیز ذہانت کا مالک ہے۔ اس کی شخصیت قہقہوں کے پھول کھلاتی ہے اور مسکراہٹوں کے طوفان لاتی ہے۔ ریشہ دوانیوں، سازشوں، غلاظتوں اور غداریوں کی بیخ کنی کے لئے ہمہ وقت تیار ملتا ہے۔ اس کی وضع داری روایت نباہنے تک محدود نہیں بلکہ خود اپنی روایات قائم کرنے کی صفت بھی رکھتی ہے۔ وہ کھلے ذہن، راست فکر، سنجیدہ و متین تجزیے، نکتہ آفرینی سے متّصف اور دردمندی و اخلاص سے بھرپور ایسا جاسوس ہے جس کی دانش و حکمت اور انسیت و نسبت کا دارومدار وطن دوستی سے عبارت ہے۔ دشمن کو وہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ زندگی کی مثبت جہتیں اس کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ طنز و مزاح اس کی شخصیت کا فطری عمل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عمران کی طبع موزوں اور مزاج جاسوسی کے بعد طنز و مزاح کے لئے بنا ہے۔ ابنِ صفی کی ایک بڑی خوبی ہے کہ فریدی، حمید، قاسم اور عمران ساتھ ہی جیمسن اور جوزف جیسے کردار کا ایسا البم آویزاں کیا ہے۔ جس میں طنز اور مزاح کی تصویریں مسکان بکھیرتی ہیں۔ چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں لانے کے لئے عمران کا کردار انواع و اقسام کی نمکیات سامنے لاتا ہے۔ جن میں ہنسی اور نشتر کا امتزاج ہے۔

ابنِ صفی واقعات کے الجھاوے کو ایک لمحے کے لئے بھی ذہن سے دور نہیں ہونے دیتے، کہانی کی دلچسپیوں سے الگ نہیں کرتے اور کرید و تجسس کا طلسم آخر وقت تک برقرار رہتا ہے۔ ناول "چیختی روحیں" میں عمران ہر طرح سے عظیم الشان نظر آتا ہے:

"تم مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

"نہیں دمبہ۔ بکرے مجھے پسند نہیں ہیں۔" عمران بڑی سنجیدگی سے بولا کیونکہ اس کے جگالی کرنے کے انداز میں بڑا گھریلو پن پایا جاتا ہے۔"

(چیختی روحیں)

عمران کا جوزف کے ساتھ ایک مذاق اس طرح ہے:

"عمران اتنی آہستگی سے باورچی خانے میں داخل ہوا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی۔ اور نہ اسی کا علم ہوسکا کہ رم کے جگ کی جگہ پانی سے بھرے ہوئے دوسرے جگ نے لے لی ہے۔ پھر عمران واپس بھی چلا گیا لیکن جوزف تو ابلنے والی دال کی "کھدبد" میں کھویا ہوا تھا اور شاید اسے اپنا وطن یاد آرہا تھا۔ برطانوی مشرقی افریقہ کے ایک گاؤں کی وہ کدال یاد آرہی تھی جہاں اکڑو بیٹھ کر وہ چاول اور گوشت ابالا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھاڑ سا منہ پھاڑ کر ایک طویل انگڑائی لی اور جگ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن اس کی نظریں ابلتی ہوئی دال ہی پر تھیں۔ جگ کو ہونٹوں سے لگاتے وقت اس نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی کہ اس میں کیا ہے۔ وہ تب ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا تھا جب اس نے گھونٹ لیا تھا۔

پیروں کے قریب پڑے ہوئے جگ کو اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن پانی کا گھونٹ ابھی منہ ہی میں محفوظ تھا اور دونوں گال پھولے ہوئے تھے۔ پھر وہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میز پر اور کوئی دوسرا جگ بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اندازے کی غلطی سمجھتا۔ یک بیک اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی "بھاں"۔ منہ سے پانی اچھل کر دور تک گیا تھا۔

"بھبھ...... بھوت"۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں چیختا ہوا باورچی خانے سے نکل بھاگا۔"

(چیختی روحیں)

بدروح اور جادو ٹونا کرنے والوں پر ابنِ صفی نے عمران کے ذریعے گہرا طنز کیا ہے۔ عمران کے "نقش" کا کیا کہنا:

''روحیں۔''

''اوہ''۔ اگا تھا اچھل پڑی اور خوفزدہ آواز میں بولی ''یہاں بھی آتی ہیں روحیں؟''۔

''بالکل آتی ہیں''۔ عمران نے نتھنے سکوڑ کر زور زور سے سانسیں لیں۔ بالکل اسی طرح جیسے روحوں کی موجودگی سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر سر ہلا کر بولا ''قطعی آتی ہیں مادام! مگر پوری طرح نہیں، صرف اپنی پر چھائیاں ڈالتی ہیں''۔

''تو پھر ہم سب خطرے میں ہیں''۔

''یقیناً۔۔۔ آپ سب بھی جنگل کی خاک چھان سکتے ہیں''۔ عمران نے جواب دیا۔

اگا تھا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''ڈریئے نہیں۔ میں آپ کو ایک طلسمی نقش دوں گا اور آپ سب ان روحوں سے محفوظ رہیں گے۔'' عمران نے مٹن پایوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ بہر حال ناشتہ تگڑا ہی ہوا تھا۔ شکم سیر ہونے کے بعد اس نے اس سے قلم دوات اور کاغذ مانگا تا کہ ''نقش'' تحریر کر سکے۔ نقش یہ تھا:

''سیاں نے انگلی مروڑی رے۔ رام کسم شرما گئی میں۔''

اس نے اسے تعویز کی طرح تہہ کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''کل صبح جب سورج نکلے تو اسے داہنی مٹھی میں دبا کر مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جایئے گا۔ صرف پانچ منٹ تک کھڑے رہنا پڑے گا۔ پھر اس کے بعد اسے مکان کے اندر ہی کہیں دفن کر دیجئے گا۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ لوگ روحوں کے شر سے محفوظ رہیں گے لیکن موسیو مائیکل پر سایہ ذرا گہرا ہے اس لئے ان کا معاملہ ذرا دیر سے سلجھے گا۔''

''شکریہ''۔ اگا تھا نے تعویز اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا ''میں کسی

سے بھی نہیں بتاؤں گی اور آپ لوگوں کی مدد کروں گی مگر آپ کہاں سے آئے ہیں۔''

''مصر سے''۔

''اوہ۔۔۔ مصری جادوگر''۔

''ہاں۔۔۔ میں فرعون کے مقبرے میں بیٹھ کر اس کی روح کے ساتھ لوڈو کھیلا کرتا تھا''۔ عمران نے فرانسیسی میں کہا اور پھر اردو میں بڑبڑایا ''ایسا جھوٹ اگر شیطان بھی بولتا تو اسکا کلیجہ شق ہو جاتا''۔ (چیختی روحیں)

ابنِ صفی کا ایک ناول ''دوسرا پتھر'' ہے۔ اس میں Lesbinism پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ہندوستان سے لاکھوں روپے کے شکاری باز اسمگل کئے جانے والے تھے۔ حالانکہ اُن دنوں ابنِ صفی شدید بیمار چل رہے تھے پھر بھی اس تازہ خبر کو اپنے اس ناول کا جزو بنایا ہے اور اسلام مذہب کے فقر و فاقہ اور صبر و قناعت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ سب کچھ بیحد طنزیہ انداز میں ہے۔ اور طنز کا یہ رنگ صرف ابنِ صفی کا حصہ ہے:

''میرے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کیا؟''۔

''تم لفنگی ہو۔''

''کیا مطلب؟''۔

''شہلا کا پیچھا کیوں کرتی ہو؟''۔

''وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔''

''ارے واہ۔ کیا بات ہوئی یہاں عورتیں عورتوں کا پیچھا نہیں کرتیں۔ ہم بیحد شریف لوگ ہیں۔''

''ہوا کرو۔ لیکن میں سویڈش ہوں۔ ہمارے یہاں ایسی کوئی پابندی نہیں۔''

''تو پھر سویڈن ہی چلی جاؤ''۔

''اسے بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ تم دیکھ لینا۔''

''ارے جاؤ۔۔۔ لے جا چکیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ میری ہونے والی منگیتر ہے۔

بہت جلد ہماری منگنی کا اعلان ہو جائے گا؟"

"اس کے باوجود بھی میں اسے یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ تمہارا دل چاہے تو تم بھی چلو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہم دونوں مل کر اسے چاہیں گے۔"

"مم...... میں اپنے والد صاحب سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" عمران بوکھلا کر بولا۔

"اتنے بڑے ہوگئے اور اب بھی باپ سے پوچھ کر بتاؤ گے۔"

"ہاں، ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے۔"

"تم مسلمان لوگ بھی عجیب ہو۔"

"تم مسلمانوں کے بارے میں کیا جانو۔"

"میں نے باقاعدہ اسٹڈی کی ہے اور کچھ دنوں تک مسلمان بھی رہ چکی ہوں۔"

"کچھ دنوں تک کی کیا بات ہوئی؟"۔

"ایک انڈونیشی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اسے مزید متاثر کرنے کے لئے۔"

"اس کے بعد؟"

"میں دراصل کسی بھی مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔"

"خیر مجھے کیا"۔ عمران شانے سکوڑ کر بولا۔

"لیکن تم لوگ بڑی عجیب قوم ہو۔ کہتے ہو نا کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں۔"

"ہاں ہیں۔ بالکل ہیں۔ یہاں خون یا مٹی سے قوم نہیں بنتی بلکہ دین بناتا ہے قوم۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے یہاں اخوت ومساوات کے بڑے چرچے ہیں۔ لیکن تمہاری قوم کے پچھتر فی صد افراد فقروفاقہ اور صبروقناعت کی زندگی گذارتے ہیں اور پچیس فی صد کا یہ عالم ہے کہ دن بھر میں دو ڈھائی پونڈ لیونڈر اپنے کپڑوں پر اسپرے کر ڈالتے ہیں۔ دور کیوں جاؤ، حال ہی میں تمہاری ملک سے لاکھوں روپیوں کے شکاری باز خریدے گئے ہیں۔"

"ارے وہ تیل والے عرب بھائی تھے۔"

"تمہاری ہی قوم کے فرد تھے۔"

"بالکل تھے۔"

"تو پھر یہ کیسی اخوت ومساوات ہے۔ کیا وہی رقم جو بازوں پر ضائع کی گئی تمہاری فاقہ زدہ آبادیوں کے کام نہیں آسکتی تھی۔"

"یہ معاملہ بڑا تیڑھا ہے۔"

"آخر کیوں تیڑھا ہے؟"۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہمارا صحیفۂ آسمانی ان ہی کی زبان میں اترا ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہوگی کہ عربی کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔ ہوسکتا ہے بعض الفاظ سے تیل والوں کو اس کی چھوٹ مل گئی ہو۔"

"مجھ سے نہیں اڑ سکتے۔ میں نے بہت پڑھا ہے۔ مال کے بارے میں تمہارے یہاں بنیادی اصول یہ ہے کہ سارا مال خدا کا ہے اور لوگوں کے پاس اللہ کی امانت کے طور پر رہتا ہے اور اسے صرف اسی کے احکامات کے تحت صرف کیا جاسکتا ہے۔"

عمران بغلیں جھانکنے لگا۔ اور وہ ہنس کر بولی "ساری دنیا کے مذاہب کا لٹریچر اکٹھا کر دیا جائے تو اسلامی لٹریچر کا عشر عشیر بھی نہ ثابت ہوگا اس کے باوجود بھی تم لوگوں کا یہ حال ہے۔"

عمران کا سارا جسم پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ (دوسرا پتھر)

بعض مسلم ممالک میں نشہ آور اشیاء پیدا کی جاتی ہیں اور اس سے مالی منفعت لیتے ہیں۔ مسلمان تساہل پسند بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس طرف بھی ابنِ صفی نے اشارہ کیا ہے اور طنز کی منظر کاری سے معاشرہ کے اس اندھے پن سے آگاہ کیا ہے:

"تم نے میرے سو روپے یومیہ کیوں بند کر دیئے باس؟"۔

"اس عمر میں زیادہ گھی دودھ کھانا مناسب نہیں ہوتا۔"

''میں سمجھوں گا سلیمان کے بچے سے۔''

''اس سے کیا سمجھے گا۔'' عمران نے آنکھیں نکالیں۔

''اسی نے بہکایا ہے تمہیں۔''

''ہاں یہ اطلاع ضرور دی تھی کہ تو چرس پینے لگا ہے۔''

''گھٹیا والی نہیں پیتا۔ اس کا ایکسٹریکٹ استعمال کرتا ہوں۔ سگریٹ پر لکیر کھینچی اور بس۔''

''اور جوانی برقرار رکھنے کے لئے گھی دودھ۔''

''میں مر جاؤں گا باس اگر تم نے چرس چھڑوائی۔ پوری اسلامی دنیا میں پی جاتی ہے اور اس اسلامی ملک میں بنائی جاتی ہے۔ اور پھر تمہاری آسمانی کتاب میں چرس کا کوئی ذکر بھی نہیں ملتا۔''

عمران نے خاموشی سے پرس نکالا۔ اور ایک لال نوٹ کھینچ کر اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا ''معافی چاہتا ہوں مسٹر جوزف۔ لیکن یہ بہت برا ہے مسٹر جوزف کہ تم بھی مسلمانوں کی طرح بکواس زیادہ کرنے لگے ہو اور کام کا دور دور تک پتا نہیں۔''

(دوسرا پتھر)

زبان کے جاننے اور نہ جاننے پر ابنِ صفی کا یہ طنز دیکھئے۔ وہ بھی عمران کی زبانی۔ یہ اقتباس ناول ''عمران کا اغوا'' سے لیا گیا ہے۔ دلچسپیوں سے بھرپور، تحیر اور استعجاب کے ساتھ سحر انگیز قلم نے بہت ہی خوبصورت انداز میں ہنسی اور قہقہوں کے رنگ برنگے پھول کھلائے ہیں:

''اسم گرامی کیا ہے شہزادے صاحب۔''

''ہم نہیں پہنتے۔ ہمیں اس سے بھی نفرت ہے۔'' عمران نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

اور لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

پھر ایک بولی ''ہم نہیں سمجھے۔''

''اسم گرامی کیا ہوتا ہے۔'' عمران نے پوچھا۔

''ارے...... یہی — نام۔''

''او...... ہوہوہوہو۔'' عمران احمقانہ انداز میں ہنسا ''ہم سمجھے تھے شاید تاج کو کہتے ہیں۔ اتنی گاڑھی اُردو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم ابھی اُردو سیکھ رہے ہیں۔''

عمران کا لہجہ سچ مچ ایسا ہی تھا جیسے اُردو اس کی مادری زبان نہ ہو۔

''آپ کے یہاں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔''

''ہماری زبان کمپولی کٹنگا کہلاتی ہے۔''

''یہ کیسی ہوتی ہے، کچھ بول کر سنائیے۔''

''کیا بول کر سنائیں۔'' عمران نے حیرت سے کہا۔

''کچھ بھی، جو سمجھ میں آئے۔''

''اچھا۔'' عمران کچھ سوچتا ہوا بولا ''خیر — تو یہ بولتے ہیں ہم — بینے دھر اب نی لکڑی آموداداکش چی پوں۔''

لڑکیاں ہنسنے لگیں اور عمران نے برا سا منہ بنایا۔ تیسری سنجیدہ لڑکی نے دونوں کو ڈانٹا۔ اور عمران سے بولی ''آپ کچھ خیال نہ فرمائیے گا شہزادے صاحب، یہ بہت شوخ ہیں۔ ہاں تو اس جملے کا مطلب کیا ہوا۔''

''ہمیں انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی بہت دلکش لگتی ہے۔'' عمران نے ترجمہ سنایا۔

(عمران کا اغوا)

لفظ نوج کی بخیہ گری ابنِ صفی اس طرح کرتے ہیں:

''آپ ویسے بھی خاصی اُردو بول لیتے ہیں لیکن لہجہ پر قادر نہیں ہے۔ اس کی البتہ مشق بہم پہنچانی پڑے گی۔''

''مشق — ہاں — ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہائے اللہ، اوئی اللہ اور الاقسم بالکل اسی انداز میں کہیں جیسے آپ لوگ کہتے ہیں۔ مگر ہم سے نہیں بنتا۔ کتنا اچھا لگتا ہے کانوں کو، کتنا بھلا لگتا ہے۔ اچھا یہ نوج کیا ہے۔ ہم اس کے معنی

نہیں سمجھتے۔ایک بوڑھی عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے اس سے کیا کہا تھا جس کے جواب میں اس نے ناک پر انگلی رکھ کر نوج کہا تھا۔ہم نے اردو کی لغات چھان ماری لیکن اس لفظ کے معنی ہمیں کہیں نہ ملے۔آپ بتائیے۔"

"مم...... میں...... بتاؤں؟۔" شالی کچھ سوچتی ہوئی ہکلائی۔

"ہاں بتائیے تاکہ ہمیں اس کے استعمال کا سلیقہ ہو سکے۔"

"ارے واہ۔آپ بھی ناک پر انگلی رکھ کر نوج کہہ لیا کیجئے۔" ڈرائیو کرنے والی لڑکی نے کہا۔

"مگر سوال یہ ہے کہ معنی معلوم ہوئے بغیر ہم اسے کیسے استعمال کر سکیں گے۔مثلاً ہمیں یہ تو معلوم ہی ہونا چاہئے کہ ہم کب نوج کہیں۔"

"میں بتاؤں گی۔" لڑکی نے کہا "محترمہ شالی کی اُردو بھی بہت زیادہ اچھی نہیں ہے کیونکہ ان کی ماں ہنالولو کی تھیں اور باپ شمالی لینڈ کے۔"

شالی خاموشی سے اپنا نچلا ہونٹ چبا کر رہ گئی۔کچھ بولی نہیں۔

"نوج اشاراتی اثبات بھی ہے اور صوتی بھی۔"

"ارے باپ رے، اتنی گاڑھی اُردو۔"

"آپ نے عربی اور فارسی بھی تو پڑھی ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"او ہاں— ٹھہریئے۔" عمران کچھ سوچتا ہوا بڑبڑایا "اشاراتی اثبات اچھا ٹھیک ہے۔ ہاں سمجھ گئے۔مگر صوتی — صوتی— صوتی— اور اشاراتی۔ بھئی دیکھو اثبات میں بہت زیادہ زور پیدا کرنا ہو تو ناک پر انگلی رکھ کر نوج کہئے۔"

"ارے واہ"۔عمران بچوں کی طرح خوش ہو کر اچھل پڑا "اب بالکل سمجھ میں آ گیا۔شکریہ۔"

(عمران کا اغوا)

اردو کے بعض دیگر الفاظ اور اعراب کے سلسلے میں ابنِ صفی کا یہ طنز ملاحظہ کیجئے:

"اچھا اب خاصہ تناول فرمالیجئے۔"

"خاصہ کیسے تناول فرمایا جاتا ہے۔" عمران نے حیرت سے پوچھا۔

"اوہ مطلب یہ کہ کھانا کھا لیجئے۔"

"ذرا ٹھہریئے۔ یہ نئے الفاظ والا جملہ مجھے لکھ لینے دیجئے۔" عمران نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور فاؤنٹن پن سے لکھنے لگا—اور الفاظ زبان سے بھی ادا کرتا رہا "خاصا— تناول— فرمالیجئے—اوہ—دیکھئے—! یہ بڑی مصیبت ہے! خاصا کیسے لکھا جائے— "س"، "ص" یا "ث" سے۔ بس اسی معاملے میں آپ کی اُردو پر بڑا غصہ آتا ہے۔آواز ایک ہی جیسی مگر— یہ چرخا لگا ہوا ہے! پھر یہ کمبخت زیر زبر پیش، جو عام طور پر تحریر میں نہیں آئے—ایک بار ہمیں بڑی شرمندگی ہوئی تھی! ہمارے ابا حضور بھی اردو کے عالم ہیں۔لہٰذا وہ اکثر ہم سے اُردو میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ تاکہ دوسرے ہماری گفتگو کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ جب ہم اُردو سیکھ ہی رہے تھے۔ایک دن ہم نے ایک مکالمہ پڑھا جس میں کسی نے کسی سے پوچھا تھا کہ کیا تمہیں میری یاد آئی تھی۔اس پر جواب دینے والے نے کہا تھا کہ آپ کی یاد تو دم کے ساتھ ہے۔اُسی دن ابا حضور نے کسی معاملے میں پوچھ لیا کہ چھوٹے شاہ، ہم تمہیں یاد آتے تھے— ہم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، عالیجاہ آپ کی یاد تو دُم کے ساتھ ہے۔یعنی ہم نے دَم پر پیش لگا دیا۔! حضور ابا کو جلال آیا۔ہم کتاب لینے دوڑے گئے جس میں یہ جملہ پڑھا تھا۔حضور ابا نے دیکھا اور سر مبارک پیٹ لیا۔ کہنے لگے، یہ بڑی مصیبت ہے۔ اچھا اب ہم اُردو کی کوئی ایسی کتاب دیکھنا پسند نہیں کریں گے جو معرب نہ ہو— ساری ریاست میں اعلان کرا دیا کہ اُردو کی ساری کتابیں محکمہ تعلیم کے سربراہ کے دفتر میں جمع کر دی جائیں! دو ہی دن میں ہزاروں کتابوں کا ڈھیر لگ گیا! حضور ابا کو اس کام کے لئے ایک الگ محکمہ

قائم کرنا پڑا جو دن رات مطبوعہ کتابوں میں صرف زیر زبر پیش لگایا کرتا ہے! بہر حال اس کے بعد ہم اس قابل ہوئے تھے کہ آلو اور اُلو میں تمیز کر سکیں۔''

(عمران کا اغوا)

ابنِ صفی مکھی پر مکھی نہیں مارتے۔ اپنی ذہانت، زیرکی اور ذکاوت سے کام لیتے ہوئے فن کو بلندی تک پہنچاتے ہیں۔ بڑھے ہوئے بالوں والے شاعر پران کا طنز قاری کو کئی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے:

''واہ، ہم نے تو بہت دیکھے ہیں ایسے آدمی، وہ شمعون ودلالہ...... اف فوہ ...... وہ تو بڑی بڑی عمارتیں گرادیا کرتا تھا۔''

''شمعون ودلالہ''۔ لڑکی نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''ارے ہاں...... وہ سینما میں ہوتا ہے نا...... اس کا نام کچھ اور تھا۔ ہم نے اس کا عربی میں ترجمہ کرلیا ہے وہ تھا نہیں...... جس کی قوت بالوں میں تھی۔ سر مونڈ دیا گیا تھا تو بالکل بھینس ہو کر رہ گیا تھا۔ ہمیں یقین نہیں آیا تھا لیکن پھر یقین آ گیا تھا۔''

''اچھا میں سمجھی۔ آپ شاید سیمپسن اینڈ ڈی لائلہ کی بات کر رہے ہیں۔ مگر آپ کو کیسے یقین آیا تھا۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آیا۔''

''نہیں، بالوں میں ہوتی ہے قوت، کسی نہ کسی قسم کی قوت ضرور ہوتی ہے۔ وہ اسے کیا کہتے ہیں اردو میں جو گیت بناتا ہے۔ ہماری زبان میں تو بگڈم کہلاتا ہے۔''

''گیت بناتا ہے۔'' لڑکی کچھ سوچتی ہوئی بولی ''پوئٹ...... او ہاں، شاعر ...... اردو میں شاعر کہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہمیں یاد نہیں تھا۔ ویسے ہم یہ لفظ سینکڑوں بار پڑھ چکے ہیں۔ ہماری ریاست میں بھی بہت سارے شاعر ہیں جو۔ بے تحاشہ بال بڑھاتے ہیں ہم یہ سنیما شمعون دلالہ دیکھ کر واپس گئے تھے اور بالوں کی الجھن میں

گرفتار تھے، چاہتے تھے کہ اس کا تجربہ کریں۔ بس ایک دن ایک مجلس سے ایک شاعر کو پکڑوا کر اس کے بال کٹوا دیئے۔ اس دن سے جو اسے چپ لگی ہے تو آج تک لگی ہوئی ہے۔ اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تب سے ہم بالوں کی قوت کے قائل ہو گئے ہیں۔''

(عمران کا اغوا)

ابنِ صفی کا ناول ''رات کا بھکاری'' ان کے انتقال کے بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اکیسویں صدی کے لئے طنز آمیز پیشن گوئی بہت ہی بھیانک ہے۔ اکیسویں صدی کے بارہویں سال میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ضرورت نظر دوڑانے اور محاسبہ کرنے کی ہے کہ یہ طنز کتنا عمل پذیر ہے:

''لیکن سلیمان ہے کہاں؟''

''کمرے میں۔ گلرخ نے باہر سے قفل ڈال دیا ہے۔ کہتی ہے کہ کم از کم پندرہ دن تک بند رکھوں گی۔''

''یہ ہوئی نا بات'' عمران خوش ہو کر بولا۔

''اس سے بہتر تو یہی ہوتا باس کہ تم خود اسے مار پیٹ لیتے۔ عورت کے ہاتھوں تو نہ ذلیل ہوتا۔''

''خدا کا شکر ادا کر کہ تو شادی شدہ نہیں ہے ورنہ تجھے تو زندہ ہی دفن کرادیتا۔''

''نہیں باس۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔ بھلا کوئی بات ہے کہ بیوی، شوہر پر حملہ آور ہو۔''

''بیوی تو شوہر کو گدھے گاڑی میں جوتے گی۔ بس ذرا اکیسویں صدی شروع ہونے دے۔''

(رات کا بھکاری)

ابنِ صفی سمجھتے تھے کہ مشرق پر مغرب حاوی ہوتا جارہا ہے جس کا برا اثر خواتین پر یقیناً پڑے گا۔ ۱۹۷۸ء میں ہی وہ طنزیہ لہجے میں کہہ چکے تھے:

"اوہ نہیں۔" جولیا جلدی سے بولی "میں سمجھتی ہوں، وہ بہت اچھا آدمی تھا۔
اسے فرانس کی عورتوں کی بے راہ روی ناپسند تھی۔ وہ مشرق کا اسی لئے مداح
تھا کہ یہاں اب بھی خیالات میں پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ لوگ برائی کو
برائی ہی سمجھتے ہیں۔ اسے تفریح کا نام دے کر اس کا پرچار نہیں کرتے۔"

(موت کی آہٹ)

ابنِ صفی کی پیشن گوئی بعض دوسرے معاملات میں بھی ہوئی ہے۔ ناول اگرچہ
جاسوسی ہوتے ہیں لیکن معاشرتی زندگی کے دیگر پہلو پر بھی ان کے قلم کی چلت پھرت دیکھی
جاسکتی ہے۔ گھریلو سجاوٹ پر یہ طنز عمران کی زبانی ہے:

"کیا حماقت ہے۔" عمران جھلا گیا "جو بھی یہاں آتا ہے، ہنسنے لگتا ہے۔
گویا میں اُلو ہوں۔"

"اور تم اپنی تصویر یہاں لگانا بھول گئے۔" رینی نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھول نہیں گیا، بلکہ مصلحتاً نہیں لگائی۔ کئی آدمی مجھ سے لڑ پڑے کہ میں نے
ان کی تصویر پرانے کمرے میں کیوں لگا رکھی ہے۔"

رومیلا بڑی دلچسپی سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔ مختلف جگہوں پر اونچے
اونچے اسٹولوں پر بالٹیاں، دیگچیاں اور سیلاپچیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"سب کیا ہے۔" رومیلا نے پھر کہا۔

"یہ سب کچھ آج سے ایک ہزار سال بعد کے لئے ہے۔" عمران نے
جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"۔

"اب مطلب بھی بتاؤں۔" عمران جھنجھلا کر بولا۔

"میں بتاتی ہوں مطلب"۔ رینی مسکرا کر بولی "پرنس آف ڈھمپ کا خیال
ہے کہ جس طرح آج ہم لوگ اپنے کمروں میں قدیم یونانی اور مصری
ظروف رکھتے ہیں اسی طرح اب سے ایک ہزار سال بعد یہ بالٹیاں، یہ

دیگچیاں اور یہ سیلاپچیاں کمروں کی زینت بنیں گی۔"

"اور یہ گدھوں کے سر۔" رومیلا نے الو بنانے والے انداز میں پوچھا۔

"یہ تاریخی گدھے ہیں۔" عمران گرج کر بولا "یہ چنگیز خاں کے گدھے کا
سر ہے۔ یہ گدھا فرعون چہارم کے چچا کا تھا۔" (لاشوں کا بازار)

ابنِ صفی کے نئے اسلوب، بہترین کردار نگاری، حالات حاضرہ پر گہری نگاہ، شگفتہ
انداز تحریر اور طنز و مزاح کے نشتر نے جاسوسی ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ بیسویں صدی
کی ساتویں دہائی کے بعد دنیا کی ترقی میں تیزی ایسی آئی کہ مذہب کو بھی لوگ سیاست کا مہرہ
بنانے لگے، ابنِ صفی نے یہ سب دیکھا اور بیان کیا ہے۔۔ لیکن ان کے لہجے کی نشتر زنی ذہن
کو جھنجھوڑتی ہے:

"میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا، اگر اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی
کوشش کی۔" شہباز غرایا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ اگلے چاند تک کچھ نہیں ہوسکتا۔" عمران نے سفید مادہ سے کہا۔

"آخر کیوں؟"۔"

"پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مذہبی جانور ہے۔"

"مذہب کا چاند سے کیا تعلق۔ اگر یہ تمہارے بیان کے مطابق کرسچین ہے۔"

"اوہو۔۔ ہم لوگ کرسچین تو ہوگئے ہیں لیکن اپنی آبائی رسوم کب چھوڑی
ہیں۔ انہیں بھی شامل کرلیا ہے مذہب میں۔"

"تب پھر تم خود کو کرسچین کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"کہہ سکتے ہیں۔ سب چلتا ہے۔ بائبل میں کہاں لکھا ہے کہ ایٹم بم بناؤ اور
انہیں سوئے ہوئے غافل آدمیوں پر پھینک دو۔ اس کے باوجود بھی
کرسچیانٹی زندہ ہے۔"

(جنگل میں منگل)

ابنِ صفی کو نئے پرانے سبھی الفاظ کا گیان تھا۔ اور وہ اسے برمحل استعمال کرنا جانتے
تھے۔ "موتی چور کا لڈو" کا استعمال دیکھئے۔ محکمہ سراغرسانی کے کیپٹن فیاض کے لئے یہ طنز

عمران کی زبانی ہے:

''کیا ابھی تک وہ شخص نہیں آیا جس سے تم نے میرا فون ڈیٹکٹ کرنے کو کہا تھا۔''

''نہیں۔'' فیاض نے غیر ارادی طور پر کہا اور پھر گڑبڑا کر بولا ''کیا کہا تھا تم نے، آواز صاف نہیں آئی تھی۔''

''غزل سرائی جاری رکھو...... اگر ایکسچینج سے میرے فون کے نمبر معلوم کر سکے تو ساڑھے ڈھائی پاؤ موتی چور کے لڈو کھلاؤں گا۔'' (بیچارہ شہہ زور)

ایک جگہ کیپٹن خاور نے بھی طنز کیا ہے کہ عمران کو محاورے کا صحیح سلیقہ آتا جا رہا ہے:

''پھر سیدھا ہو کر چہرہ خشک کر رہا تھا کہ کیپٹن خاور دکھائی دیا۔ ہدایت کے مطابق وہ اسی جگہ پہنچا تھا جہاں بلیک زیرو نے اسے عمران سے ملنے کو کہا تھا:

''دن میں کتنی بار منہ دھویا جاتا ہے۔'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''جتنی بار کوئی نئی لڑکی سامنے آتی ہے ـــــ پھر دوسری کے لئے منہ دھو کر رکھتا ہوں۔''

''محاوروں کے صحیح استعمال کا سلیقہ ہوتا جا رہا ہے۔''

''ایک کا نام سلیقہ بھی ہے ـــ بہر حال اب تو منہ دھو ہی چکا ہوں دیر تک تمہاری شکل نہیں دیکھ سکتا۔'' (بیچارہ شہہ زور)

ابنِ صفی کا ایک ناول ''مونا لیزا کی نواسی'' ہے۔ پورا ناول مونا لیزا ہی کی مسکراہٹ کی طرح بیحد پُر اسرار اور دلفریب ہے۔ کم از کم جاسوسی ناولوں کے لئے یہ تصور بڑا انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن ابنِ صفی کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ناولوں میں فکر و نظر اور تخیل کی لافانی شمعیں روشن کرتے رہے۔ اس ناول میں بھی الفاظ کے استعمال سے مزاح کا پہلو نکالا گیا ہے:

''فنونِ لطیفہ سے محظوظ ہونے کے لئے تھوڑی تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔''

فوزیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''شاید آپ کو فنونِ چچی جان سے دلچسپی نہیں ہے۔'' عمران بولا۔

''یہ کون سے فنون ہوتے ہیں؟'' شگفتی اسے گھورتی ہوئی بولی۔

''میں بزرگوں کے نام نہیں لیتا۔'' عمران شرما کر بولا۔

''کیا بات ہوئی؟''

''فنون کے ساتھ آپ جو لفظ بولی تھیں وہ میری چچی جان کا نام ہے۔''

''اوہ ـــ لطیفہ۔'' فوزیہ ہنس پڑی۔

''جی ہاں۔'' عمران مزید جھینپ کر بولا۔

''اوہ ـــ تو آپ کوئی لطیفہ سناتے وقت لوگوں سے کہتے ہوں گے کہ اب ایک چچی جان سنئے۔''

''اِس دشواری کی بنا پر سناتا ہی نہیں ہوں''۔ (مونا لیزا کی نواسی)

ابنِ صفی کے دو ناول ''آدھا تیتر'' اور ''آدھا بٹیر'' ہیں۔ یہ نام جو صرف محاورے کی شکل میں اب تک ہمارے سامنے آتے رہے ہیں کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی یہ جاسوسی ناولوں کا عنوان بھی بن سکتا ہے۔ لیکن ابنِ صفی نے جس خوبصورتی سے اس نام کو استعمال کیا ہے وہ یقیناً انہی کا حصہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اس نام کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ عمران کی مضحکہ خیز حرکتوں میں زیادہ تر طنز کی چبھن ہے:

''بھائی ـــ وہ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور پاگلوں کی سی حرکت کرتا ہے۔ اس نے میرے باپ کے کھانے کی میز پر پروں سمیت آدھا تیتر لگوا دیا تھا اور اس کے نیچے ایک لفافہ بھی تھا۔ لفافے سے تحریر برآمد ہوئی تھی جس کے مطابق مجھے گولی مار دینے کی دھمکی دی گئی تھی ـــ محض اس بناء پر کہ میں نے اس لڑکی کے لئے جھوٹا گواہ مہیا کیا تھا۔''

''میرے لئے نئی اطلاع ہے۔''

''لیکن یہ آدھا تیتر کیا بلا ہے۔''

''موت کی علامت! جنوبی افریقہ کے لوگ اس علامت سے تھراتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ تو میں آج سے اپنا نشان آدھا بٹیر قرار دیتا ہوں۔ مُجھ

عمران اکڑ کر بولا۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ سنسنی ان لوگوں کے خلاف پھیلائی جاتی ہے جو سامنے ہوں۔۔ لیکن ٹھہرو۔۔ تم نے بٹیر کا نام کیوں لیا۔۔"

وہ خاموش ہو کر عمران کو گھورنے لگا۔

"بٹیر، تیتر سے زیادہ لذیذ اور دیر تک لڑنے والا پرندہ ہے۔۔ اور پھر ہماری زبان میں ایک محاورہ بھی ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔" (آدھا بٹیر)

ابنِ صفی کے سحر انگیز قلم کی نئی کرشمہ سازیاں تحیر اور سنسنی کے ساتھ ایسی فضا سامنے لاتی ہیں کہ دلچسپ واقعات کا انوکھا سلسلہ پڑھنے والے کے ذہن کو ہمہ وقت اپنی گرفت میں لئے رہتا ہے اور دل میں کرید کا جذبہ ہر لمحہ بڑھتا رہتا ہے۔ پراسرار ماحول میں بھی مسکراہٹوں کے چراغ روشن کرنا ابنِ صفی کی ذہانت کا کام ہے۔ طب مشرق اور مرض بواسیر پر غیر معمولی ذہانت دیکھئے:

"اچانک خاموش ہو کر وہ اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟" اجنبی نے کہا۔

"مائی ڈیر مشروم آپ بواسیر کے مریض معلوم ہوتے ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔"

"خواہ مخواہ"۔

"یقین کیجئے مسٹر مشروم۔ بسا اوقات مریض کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ بواسیر میں مبتلا ہے۔"

"اور آپ کو پتہ چل جاتا ہے۔" اس نے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بالکل بالکل۔۔ یہ طب مشرق کے اسرار ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"طب مشرق کے مطابق بواسیر کی علامات سب سے پہلے چہرے پر ظاہر

ہوتی ہیں۔ آپ کی دائیں طرف کی مونچھ بائیں طرف والی سے چھوٹی ہے۔"

"نہیں۔" وہ اپنی مونچھیں ٹٹولتا ہوا بولا۔

"صرف دو ملی میٹر کا فرق ہے۔ یقین نہ آئے تو ناپ کر دیکھ لیجئے۔"

"فضول بات۔"

"ناپ کر دیکھئے اگر میرا اندازہ غلط ثابت ہو تو گولی مار دیجئے گا۔"

"میں واقعی گولی مار دوں گا۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"شوق سے۔ جائیے ناپ لیجئے۔"

"میرے پاس اسکیل نہیں ہے۔"

"تاگے سے ناپ لیجئے۔۔ فرق تو ظاہر ہی ہو جائے گا۔"

"تم ان دونوں پر نظر رکھنا۔ میں ابھی آیا۔" اجنبی نے تیسرے مسلح آدمی سے کہا جو دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

پھر وہ چلا گیا۔ اور میریا حیرت سے عمران کو دیکھتی رہی۔ لیکن وہ خود اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور اس کے چہرے پر تشویش کے ایسے ہی آثار پائے جاتے تھے جیسے اجنبی کے "بواسیری غم" میں برابر کا شریک ہو۔"

(دوسرا رخ)

آدمیت، درندگی اور اخلاقیات پر یہ طنز ملاحظہ کیجئے:

"کسی بات پر جمو گے بھی۔"

"اس بات پر ابھی تک جما ہوا ہوں کہ سانولی رنگت بھی مجھے شاعر نہیں بنا سکتی۔"

"عمران آدمیت کے جامے میں رہو۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ آدمیت کا جامہ درندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ چاہے اس میں اخلاقیات کی کتنی ہی کشیدہ کاری کیوں نہ کر ڈالی جائے۔"

"اچھا اب بکواس بند کرو۔ مجھے اپنی نیند بھی پوری کرنی ہے۔"

''نیند اور درندگی کے علاوہ آدمی کے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

(دوسرا رخ)

ابنِ صفی اکثر ناولوں میں ان شاعروں اور ادیبوں پر طنز ضرور کرتے ہیں جو حلیہ سے خود کو پہنچوانے کی کوشش کرتے ہیں اور متشاعر ہیں:

''بل کون ادا کرے گا۔''

''احمق گمنام احمق۔''

''یہ کون صاحب ہیں؟۔''

''ہیں ایک صاحب۔ وہیں بیٹھے ہوئے مل جائیں گے۔''

''جغرافیہ کیا ہے۔''

''ٹی وی کے لئے چیپ قسم کے ڈرامے لکھتے ہیں اور غیر ملکی نظموں کے ترجمے کر کے خود کو شاعر سمجھنے لگے ہیں۔''

''کچھ چہرے مہرے کی بھی بات ہو جائے۔''

''شکل دیکھ کر خواہ مخواہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ پتلون کے اندر چھوٹی سی دُم ضرور پوشیدہ ہوگی۔'' (دوسرا رخ)

ابنِ صفی کا ایک ناول ''دلچسپ حادثہ'' ہے۔ اس میں عمران ابتداء ہی سے مخبوط الحواس نظر آتا ہے۔ لیکن کہانی میں نرم و نازک گوشے ہیں جہاں انسانی زندگی کی ان حقیقی اور پاکیزہ قدروں کی نمائندگی ملتی ہے جس سے زندگی — بچی کھچی زندگی میں اور انسانیت میں تقدس ہے۔ ابنِ صفی کی نگاہ فلموں پر بھی تھی، اسلامی فلموں پر ان کا طنز جھنجھوڑنے والا ہے:

''عمران، فیاض سے کہہ رہا تھا ''ہاں — اسلامی فلموں کا آئیڈیا بھی برا نہیں ہے۔ مگر چالو قسم کے ڈائریکٹر اسلام کی بھی مٹی پلید کر دیتے ہیں اور فلم کی بھی۔ حال ہی میں ایک فلم دیکھی تھی میں نے جس کے بادشاہ سلامت غیر قوموں کے سرداروں کو اپنے دربار میں مدعو کر کے تبلیغ کیا کرتے تھے — اف فوہ — ان کی تقریر کا انداز — بالکل یہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی فٹ

پاتھی حکیم مجمع لگائے سرمہ بیچ رہا ہو۔'' (دلچسپ حادثہ)

ابنِ صفی اپنے کردار کی نفسیات پر ہر ناول میں روشنی ڈالتے ہیں، عمران کی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ جس میں طنز ہی طنز ہے:

''عمران مسہری پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے نرس سے کہا ''ریڈیو پر کمرشیل سروس سننا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا — حالانکہ اشتہارات سننے کے شوق میں مجھے خواہ مخواہ لتا منگیشکر اور نور جہاں وغیرہ کو بھی ہضم کرنا پڑتا ہے۔''

''ہضم کرنا پڑتا ہے۔'' نرس نے حیرت سے کہا۔

''اور کیا! گانا نہ سنو تو وہ اشتہارات بھی نہیں سناتے۔''

''کیا لتا اور نور جہاں آپ کو پسند نہیں۔''

''وہ تو بہت پسند ہیں لیکن گاتی کیوں ہیں۔'' عمران نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اوہ واہ — بھلا آپ کو کیوں برا لگتا ہے۔''

''خوبصورت عورتوں کو گاتے دیکھ کر بیحد غصہ آتا ہے مجھے۔''

''آخر کیوں؟۔''

''پتہ نہیں! خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔''

نرس نے ہنس کر ریڈیو کھول دیا۔ ذرا دیر بعد آواز آئی ''گرم مسالحہ ہانڈیوں کی زینت ہے۔ مولوی داؤد علی اینڈ کمپنی کا گرم مسالحہ مُہر بند بوتلوں میں خریدیے۔'' اور اس کے بعد ''نہ چھڑا سکو گے دامن......۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' عمران کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چیخا ''تقریباً چھ مہینے سے یہ عورت دامن پکڑے ہوئے ہے۔ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی کسی طرح...... اے اللہ اب تو موت ہی دیدے...... ہوٹلوں میں، شادی بیاہ کے موقع پر ریڈیو پر...... جہاں دیکھو دامن پکڑے کھڑی ہے......۔''

(موت کا مہمان)

ابنِ صفی، سلیمان کی نفسیات کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا ہر ناول میں خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کہانیوں میں یکسانیت نہ پیدا ہونے پائے اور سراغرسی کی سنگلاخ وادیوں میں بھی زندگی کے نازک پہلوؤں پر روشنی پڑتی رہے۔ ساتھ ہی تازگی اور شگفتگی میں فرق نہ آئے:

"شادی کیوں نہیں ہوئی؟"

"میٹرک پاس کئے بغیر کیسے ہوجاتی۔" عمران رو دینے کے سے انداز میں بولا۔

"تو وہ ایم۔ ایس۔ سی۔ ڈی۔ ایس۔ سی صاحب کون ہیں جن کی نیم پلیٹ دروازے پر لگی ہوئی ہے۔"

عمران نے سلیمان کو آواز دی۔

"یہ ہے وہ آدمی"۔ عمران نے سلیمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا جو دروازے میں ہکا بکا کھڑا تھا۔

نرس نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

"یہ میرا باورچی ہے۔ ایم۔ ایس سی۔ ڈی۔ ایس۔ سی۔ آکسن۔ لیکن اسے اپنے فن سے پیار ہے۔ فن کی خدمت کے لئے یہ اتنی لمبی لمبی ڈگریوں پر لات مار کر چولہا ہانڈی کر رہا ہے۔ کیا قورمہ پکاتا ہے ظالم — ایک بار تو مونگ کی دال کے کوفتے کھلا دیئے تھے مجھے — اب تک کئی قسم کے سالن ایجاد کر چکا ہے —— ابے وہ کون سی ہانڈی ہوتی ہے جس میں ساری ترکاریاں — گوبر سمیت پڑتی ہیں۔"

"جی، دیوانی ہانڈی۔" سلیمان نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی نئی چیز نہیں۔" نرس بولی۔

"اور کوفتوں میں مسور کی دال۔"

"پتہ نہیں۔"

"اکثر یہ چاول میں شوربہ لگا دیتا ہے۔" عمران نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور کہتا ہے کہ جرمنی میں یہ ڈش جھاپک ڈوشا کہلاتی ہے۔"

"کیا واقعی — یہ سائنس کے ڈاکٹر ہیں۔"

"بالکل بالکل! شوقیہ کھانا پکاتا ہے۔ یہاں کھانا پکانے کے بعد یونیورسٹی میں کلاسز بھی لیتا ہے۔ وہاں پارٹ ٹائم لکچرر لگا ہوا ہے۔"

"نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"کیوں بے۔" عمران نے سلیمان کو للکارا۔

"ان کا کھانا بھی پکے گا۔" سلیمان نے دانت نکال دیئے۔

"ان کا — نہیں ان کے لئے بھی۔" عمران نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"انگریزی میں سائنس پڑھنے کی وجہ سے تیری اُردو کمزور رہ گئی۔ خیر مولوی تفضل علی سے مدد لیں گے۔"

(موت کا مہمان)

اخبار میں چھپے آئے دن کے اشتہار پر ابنِ صفی کا یہ طنز محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے:

"اس کی دونوں عم زاد برآمدے میں شاید اسی کی منتظر تھیں۔

"ہائے بھائی جان۔" ان میں سے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "یہ رنگت کیسی نکھر آئی ہے تمہاری۔"

"کایا پلٹ اپٹن استعمال کر رہا ہوں آج کل۔"

"یہ کون سا اپٹن ہے۔" دوسری نے پوچھا۔

"ارے۔ تم نے اشتہار نہیں دیکھا اخباروں میں۔ ہر روز نئی سرخی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ آج کے اخباروں میں سرخی جمائی تھی — شادی کیوں نہ ہوئی! کالی تھی! لیکن صرف پندرہ دن کایا پلٹ اپٹن استعمال کرنے کے بعد دس شادیاں ہوگئیں —! اور پھر یہ نگوڑ ماریاں منوں اپٹن کھا گئیں لیکن وہی کالی کی کالی — ناس ہو جائے — ہاں نہیں تو۔" عمران نے خاموش ہو کر کسی

جلے تن شوہر خور کی طرح گردن جھٹکی۔" (موت کا مہمان)

عمران کی سادہ لوحی پر کبھی کبھی اس کا باڈی گارڈ جوزف بھی الف بن جاتا ہے:

"جوزف۔" عمران نے ہانک لگائی "کون ہے؟ آنے دو۔"

"نہیں آنے دوں گا باس۔" جوزف نے باہر سے عربی میں جواب دیا "کیونکہ تم منع کر چکے ہو۔"

"اب کہتا ہوں آنے دے۔" عمران کی آواز غصیلی تھی۔

"ہرگز نہیں آنے دوں گا باس کیونکہ اس نے مجھے آبنوس کا کندۂ ناتراش کہا ہے۔"

"ارے تو بھی اسے مکھن کا پہاڑ کہہ کر معاف کر دے۔"

"کیا بات ہے۔" سر سلطان نے پوچھا۔

"میرا باڈی گارڈ سنک گیا ہے۔ کہتا ہے چونکہ وہاں اس وقت سر سلطان بیٹھے ہیں اس لئے میں کسی کم رتبہ عورت کو اندر نہیں جانے دوں گا۔"

"ارے نہیں — کوئی بات نہیں۔" سر سلطان نے بڑے خلوص سے کہا اور پھر نچلے ہونٹ پر زبان پھیرنے لگے۔

"جوزف، کیا مجھے اٹھنا پڑے گا۔" عمران نے پھر ہانک لگائی۔

"اچ چھا — باس — آ رہی ہے۔" جوزف نے مردہ سی آواز میں کہا۔

(موت کا مہمان)

عمران کی نوکرانی گل رخ بھی اسے اہمیت نہیں دیتی۔ دراصل عمران کی عجیب و غریب شخصیت ہی کہانی کی دلچسپیوں میں اضافہ کرتی ہے:

"واقعی بہت دنوں سے آپ کو مرغ کی ٹانگیں نہیں ملیں۔ وہ کہتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ٹانگیں کیا کھائے گا۔ اور ایک خود کھا لیتا ہے دوسری مجھے کھلا دیتا ہے۔"

"اتنا بڑا آدمی — یہ کس کا ذکر ہے۔"

"آپ کا صاحب جی۔" وہ لہک کر بولی۔

"اچھا۔" عمران اس سے بھی زیادہ خوش ہو کر بولا "پورا مرغ تم دونوں کھا لیا کرو۔ میں بھیک مانگ کر گزارہ کر لوں گا۔"

"خدا نہ کرے۔"

"تم دونوں مجھے اتنا بڑا آدمی سمجھتے ہو تو اب یہی سہی۔"

"میں ہر معاملے میں بے قصور ہوں۔ یہ سب کچھ وہی کرتا ہے۔"

"تجھ سے شادی بھی تو اسی نے کی تھی۔"

"بڑے سرکار کی دھونس تھی ورنہ میں تو اسے جوتی پر بھی نہ مارتی۔ چوہدری سلیمان — ہونہہ۔ ایسے ہی جٹ کے پلّے باندھنا تھا تو پھر مجھے میٹرک تک پڑھوایا کیوں تھا۔"

"اتنے قابل آدمی کو جٹ کہہ کر کیوں اپنی عاقبت خراب کرتی ہے۔"

"قابل۔" وہ ہنس پڑی۔

"خیر — خیر...... ہاں تو میں باہر جا رہا ہوں۔ میری کوئی کال آئے تو کہہ دینا کہ میں — لیکن کیا کہہ دینا۔" عمران خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا اور گلرخ بولی "کہہ دوں کہ وہ اوورسیز فلائی کر گئے ہیں۔"

"نہیں بٹر فلائی پکڑنے گئے ہیں۔"

"یہ آخر تتلی کو بٹر فلائی کیوں کہتے ہیں۔ بٹر کے معنی ہیں مکھن اور فلائی مکھی کو کہتے ہیں۔ مکھن مکھی کیا بات ہوئی۔"

"بڑا خوش قسمت ہے سلیمان کہ تو اس سے اتنے بیڈھب سوال نہیں پوچھ سکتی۔" عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"یہ انگریز ہوتے ہی ہیں بونگے۔"

"اچھا اچھا — کہہ دیجو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔" عمران نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔" (پتھر کا آدمی)

تحیر و تجسس کی نئی شعاعوں کے بیچ ابنِ صفی نئی دنیا سجاتے ہیں، قہقہوں کے رنگین شاداب پھول کھلاتے ہیں اور طنز کی چبھن محسوس کراتے ہیں۔ عمران کی سادگی سے ایک اور شگوفہ دیکھئے:

"بوڑھا عمران کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"تشریف رکھئے۔" اس نے عمران سے کہا۔

"مم...... مجھے افسوس ہے کہ...... نہیں لا سکا۔"

"کیا نہیں لا سکے۔"

"تت...... تشریف۔"

"میں نے کہا تھا تشریف رکھئے...... یعنی کہ بیٹھ جایئے۔"

"شکریہ...... شکریہ...... میری اردو کچھ گڑبڑ سی ہے۔ بچپن ہی میں انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔"

"اوہ...... اچھا اچھا۔" بوڑھا مسکرا کر بولا "میں فیاض کا سسر ہوں۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔" عمران بے یقینی سے ہنس کر بولا۔

"کیا مطلب۔" بوڑھا سیریس ہو گیا۔

عمران گڑبڑا کر بولا "مم...... مطلب یہ کہ آپ اتنے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں سسر کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"جانتے بھی ہو سسر کسے کہتے ہیں۔"

"شاید کچھ واہیات سی بات ہے۔ کیونکہ میرا دودھ والا اپنے ملازم کو ابے سسرا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔"

"بکواس۔ بعض جاہل لوگ الفاظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ سسر، بیوی کے والد کو کہتے ہیں۔"

"اوہو...... تو آپ، بیگم فیاض کے والد ہیں۔" عمران خوشی کے اظہار میں اچھل پڑا اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہوا بولا "میں معافی چاہتا ہوں

جناب۔ لیکن لفظ سسر پر مجھے اب بھی اعتراض ہے۔ ارے بیوی کے والد کو تو سکندر اعظم ہونا چاہئے۔"

"کیا اب میرا مذاق اُڑاؤ گے۔"

"ہرگز نہیں جناب۔" عمران دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹتا ہوا بولا "اور بیوی کی والدہ صاحب کیا کہلاتی ہیں۔"

"آپ کی بیوی کی والدہ صاحبہ کیا کہلاتی ہیں۔" بوڑھے نے بھنا کر پوچھا۔

عمران نے شرما کر نہ صرف سر جھکا لیا بلکہ دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی مروڑنے لگا۔

"جواب نہیں دیا آپ نے۔"

"جج...... جی...... ابھی میری...... شش شادی ہی نہیں ہوئی۔"

"اچھا، اچھا۔" بوڑھا اسے دلچسپی سے دیکھتا ہوا بولا "بیوی کی والدہ کو خوشدامن کہتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن آپ جیسا اسمارٹ اور ہینڈسم آدمی سسر کہلائے یہ مجھے گوارا نہیں۔ خوشدامن...... واہ وا...... میں تو اپنے ہونے والے سسر کو ہرگز سسر نہیں کہوں گا۔ خوش پگڑی یا خوش ٹوپی کیسا رہے گا خوشدامن کی مناسبت سے۔" (پتھر کا آدمی)

فیاض کا سسر ہو۔ بڑھاپے کو طاق پر رکھ کر حسن کی رنگینیوں کی بات ہو تو ایسے میں طنز کے تیر برسنا لازمی ہے:

"بڑھاپا وغیرہ بھی صرف بیوقوفی کی باتیں ہیں۔" عمران نے کہا۔

"زندگی صرف زندگی ہے، اس پر ادوار کی چھاپ نہیں لگنی چاہئے۔"

"مگر دشواری تو یہ ہے کہ ہمیں پیدا ہونا پڑتا ہے۔" عمران نے کہا "بس پیدا ہوئے نہیں کہ ادوار میں تقسیم ہونے لگے۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ پٹ سے ٹپک پڑیں کہیں سے پلے پلائے۔"

"اب اسی ایک نکتے کو رگیدتے چلے جاؤ گے"۔ شبلی نے جھنجھلا کر کہا۔

"پھر جیسا آپ فرمائیں۔"

"حسن کی رنگینیوں کی باتیں کرو۔ اُن مہ جبینوں کو یاد کرو جن سے کبھی سابقہ رہا ہو۔"

"ارے ہاں، وہ تھی ایک......لیکن کچھ عجیب سی لگتی تھی۔"

"کون تھی۔" شبلی نے لہک کر پوچھا۔

"مہ جبیں ہی نام تھا۔ مجھے دیکھ کر رسی تڑانے لگتی تھی۔"

"رسی تڑانے لگتی تھی؟۔" شبلی نے حیرت سے پوچھا۔

"بڑے خوفناک سینگوں والی تھی۔"

"کیا بک رہے ہو۔"

"خالہ جان کی بکری تھی جسے وہ پیار سے مہ جبیں کہتی تھیں۔"

(پتھر کا آدمی)

ابنِ صفی نے زبان کے تخلیقی استعمال میں اہل زبان کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مسند نشیں اعتراف نہ کریں لیکن سچائی یہی ہے کہ سراغرسی، طنز اور ظرافت کو ایک ساتھ موضوعات سے وابستہ کرتے وقت ان کی زبان دانی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ یعنی الفاظ کی نشست و برخاست سے وہ مافی الضمیر تک پہنچتے ہیں:

"نیلی قمیض والا مر گیا۔"

"تب پھر مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔" عمران نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

"شاید رونا چاہئے۔" کیلی نے مسکرا کر کہا۔

"تب تو مجھے افسوس ہے۔" عمران سر ہلا کر بولا "یہ کیس پینڈنگ میں ڈالنا پڑے گا۔ کیونکہ فی الحال میرے پاس آنسوؤں کا اسٹاک نہیں ہے۔ پچھلے پانچ برسوں سے رونے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔"

"کیوں، رونا کیوں چاہتے تھے۔"

"میرے والد صاحب نے اپنے باپ کی موت کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس سلسلے میں دو چار آنسو ضرور بہانا چاہئے، میں نے کوشش کی لیکن آدھا آنسو بھی نہ نکلا۔ پھر میں مختلف اوقات میں اس واقعے کو یاد کر کے رونے کی کوشش کرتا رہا لیکن آنسو شاید میونسپل الکشن لڑنے چلے گئے تھے۔"

(زمین کے بادل)

ابنِ صفی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کردار کی شخصیت کو سامنے رکھ کر اسلوب اختیار کرتے ہیں اسی لئے طنز میں بھی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے:

"مگر ہے وفادار۔ میں نے آنکھ ماری تو برا مان گئی۔"

"اچھا تو آپ نے آنکھ ماری تھی۔"

"اور پٹانے کی بھی کوشش کی تھی۔ لیکن پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دی۔"

"میں رکھوا دوں۔" عمران نے بیحد محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"کتنے پیسے لو گے۔"

"سات پیسے۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو۔"

"یقین کرو۔ لیکن تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔" عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہاں؟۔"

"جہاں ہم لے جائیں۔"

"مگر سات پیسے۔"

"میرا اٹو ٹکا ہے۔ آج سنیچر ہے نا۔"

"کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔"

"اے تم گھاس تو نہیں کھا گئے۔ بات حرامی پن کی ہو رہی تھی۔ یہ مذہب

کہاں سے آ کودا۔"

"کیا بک رہے ہو، کیسا حرامی پن۔"

"پھر اور یہ کیا ہے۔ پہلے بیچاری کو آنکھ ماری، پھر پٹانے دوڑے اور اب سات
پیسے پر راضی ہوئے جا رہے ہو۔ شکل تو دیکھو اپنی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
کوئی ستم رسیدہ بکری جلدی میں بچہ دے کر بھاگ کھڑی ہوئی ہو۔"

(فرشتے کا دشمن)

ابنِ صفی کبھی کبھی تمام ابن آدم یا اشرف المخلوقات کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔
دراصل ان کا راستہ انسانیت سے ہو کر گزرتا ہے۔ اقدار، انسانی رشتے اور عوامی نفسیات کو
گرفت میں لیتے وقت طنز کوئی جہت بخشتے ہیں:

"مجھے چیونٹیوں نے حکمت سکھائی ہے۔ یہ ننھے ننھے کیڑے میرے راہبر
ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ وہ لوگوں کو ایسی جگہ لے جاتا جہاں چینٹیوں کی
قطاریں اپنی روزی اپنے ننھے ننھے جبڑوں میں دبائے رواں دواں ہوتیں۔
وہ لوگوں سے کہتا، یہ دیکھو۔ یہ سب ایک دوسرے کا بوجھ اٹھائے ہوئے
ہیں۔ اپنی یہ غذا کسی جگہ ذخیرہ کریں گی اور مزے سے پوری برسات گذار
دیں گی۔ کوئی یہ نہیں کہیں گی کہ اس دانے کو میں اٹھا کر لائی تھی۔ یہ صرف
میرا ہے۔ کیا تم لوگ چینٹیوں سے بھی زیادہ بے وقعت ہو۔ بول رے آدم
زاد۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دس آدمیوں کا کنبہ ایک کمرے میں سڑتا
رہے اور چار افراد کا کنبہ دس کمروں کی عمارت پر قبضہ جمائے بیٹھا رہے۔
بول اے آدم زاد! کیا تو چیونٹی سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ مرنے کے بعد تجھے
بھی کیڑوں کی غذا بننا ہے۔ حقیر ترین کیڑوں کی غذا۔ لہٰذا اپنی عظمت کے
گیت نہ گا۔ اپنی عقل کا ماتم کر۔"

(بلیک اینڈ وھائٹ)

شوہر اور بیوی کے رشتے کو اجاگر کرنے کے لئے ابنِ صفی طنز اور مزاح کے جھونک
سے معتبر فلسفہ پیش کرتے ہیں:

"چاند چڑھتے ہی وہ ایک جگہ بیٹھ گئے تھے اور تھیلے سے کھانا نکالا تھا۔
کھانے کے دوران زینو نے کہا "بستی میں پہنچ کر تم گونگے بن جانا۔
بھیڑوں کا سودا میں ہی کروں گی۔"

"یعنی تمہارا گونگا ملازم۔"

"ہوش کی دوا کرو۔ یہاں کے چرواہے اتنے مالدار نہیں ہیں کہ ملازم رکھ سکیں۔
میں تمہیں اپنا......اپنا......شوہر ظاہر کروں گی۔"

"وہ تو گونگا ہوتا ہی ہے۔ ظاہر واہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ شوہر بے حد بکواس کرتے ہیں۔"

"اسی صورت میں اگر بیوی سچ مچ گونگی ہو۔"

"میں سمجھ گئی۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بیویاں انہیں زبان کھولنے کا موقع ہی
نہیں دیتیں۔"

عمران کچھ نہ بولا"۔

(کالی کہکشاں)

ابنِ صفی کی ذہانت اور جدت پسندی کی آئینہ دار کہانی، ناول "آدھا تیتر" میں ملتی
ہے۔ اس کی کہانی عمران کے گھریلو ماحول سے شروع ہوتی ہے۔ عمران جب اس ماحول میں
پہنچتا ہے تو دلچسپیوں کے قمقمے روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن عمران یہاں سازش کی بو سونگھتا ہے اور
ایسی ذہنیت رکھنے والے افراد کو بے نقاب کرتا ہے، اس ناول میں تجریدی آرٹ پر ابنِ صفی کا
طنز دیکھئے:

"پچھلے دنوں ایک غیر ملکی سفارت خانے نے تصویروں کی نمائش کا اہتمام
کیا تھا۔ تمہارا یہ سلیمان بڑے ٹھسے سے وہاں پہنچا تھا اور تصاویر پر تنقید کرتا
پھر رہا تھا۔"

"اچھا۔ لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ پکاسو کا بہت بڑا مداح ہے۔
تجریدی آرٹ پر جان دیتا ہے اور جیسی تصاویر دیکھ کر آتا ہے ویسی ہی
چپاتیاں نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دن ساڑھے چار فٹ لمبی چپاتی

پکائی تھی۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ کہنے لگا۔ صدائے صحرا — اور ابدیت ابھی توے پر ہے۔"

(آدھا تیتر)

ابنِ صفی نے یورپ کی زندگی کے بعض پہلو کو بھی ٹٹولا ہے۔ اس کے لئے مشرق سے آنکھ ملانے کی کوشش کی ہے:

"عمران آئیل اسٹو و جلا کر کافی بنانے بیٹھ گیا۔

"ہٹو ادھر۔" میریانا اس کے قریب پہنچ کر بولی "یہ کام مردوں کے نہیں ہیں۔"

"ہائیں۔" عمران حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا "کیا تم یوروپین نہیں ہو۔"

"کیوں نہیں ہوں۔"

"تو پھر مجھے اس کام سے کیوں روک رہی ہو۔ میں نے لندن میں مردوں کو کھانا پکاتے اور عورتوں کو فلمی رسالے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حالانکہ دونوں ہی دن بھر کے تھکے تھکائے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔"

"ہم اتنے مہذب نہیں ہوئے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی "اور نہ ہمارے یہاں طلاقوں کی وہ شرح ہے جو یورپ کے مہذب ترین ممالک میں پائی جاتی ہے۔ ہماری اکثریت اب بھی اسی کی قائل ہے کہ عورت گھر کی ملکہ اور مرد، مرد میدان۔ اسی لئے ہمارا معاشرہ روحانی طور پر اتنا پراگندہ نہیں ہوا۔"

(خیراندیش)

ابنِ صفی ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن نئی نسل کے زاویۂ نگاہ کے لئے ان کا پیمانہ الگ ہے جس میں پرکھوں سے درمیانی رابطہ ضرور رہتا ہے۔ جنریشن گیپ کو پاٹنے کے لئے بجلی کی چمک سے وہ حقیقت کا منظر سورج آسا بناتے ہیں اور اظہار و ترسیل کے لئے مزاح کی دمک سے شناسا چہرے کو پہچان عطا کرتے ہیں:

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے تم سے انس ہو گیا ہے۔"

"ضرور ہو گیا ہوگا۔ پکا پکا کر کھلاتا جو ہوں۔"

میریانا کو ہنسی آ گئی اور اس نے کہا "واقعی بہت پیارے ہو، تم سے محبت

کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو آؤ کرو محبت۔" عمران اٹھتا ہوا بولا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہاں بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔"

وہ ہنستی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔ عمران تھوڑا سا اس کی طرف جھکا اور اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے سر پر دے مارا۔

"خدا غارت کرے۔" وہ تڑپ کر کراہی۔

"ارے، ارے! کوسنے کیوں دے رہی ہو۔"

"یہ کیا بیہودگی تھی۔" میریانا کو غصہ آ گیا۔

"محبت! کیا تمہارے یہاں محبت کرنے کا کوئی اور طریقہ رائج ہے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"سنو لڑکی! میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ بربروں کے ڈھمپ قبیلے سے میرا تعلق ہے اور میرے قبیلے میں اسی طرح محبت کی جاتی ہے۔ طالب و مطلوب بیٹھے سر لڑایا کرتے ہیں اور جس دن اتنی شدید محبت ہوتی ہے کہ دونوں کے سر پھٹ جائیں اسی دن اس کی شادی ہو جاتی ہے۔"

"کک...... کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔"

"جس سے دل چاہے پوچھ لو۔ مناسب یہ ہوگا کہ ایفریکالوجی کے کسی پروفیسر سے پوچھو۔ وہ تمہیں ڈھمپ قبیلے کی ساری رسوم سے آگاہ کر دے گا۔"

"مگر تم تو اب آدمی بن جاؤ۔ یورپ میں رہتے ہو۔"

"تم محبت میں کیا کرتی ہو۔"

"ہم پیار کرتے ہیں۔"

"پیار تو ہم صرف بچوں کو کرتے ہیں۔ اگر کسی بالغ یا بالغہ کو پیار کر بیٹھیں تو چالیس دن تک پھٹے پرانے جوتوں سے مرمت ہوتی ہے۔ میری ماں بتاتی ہے کہ ایک بار اس نے غلطی سے میرے باپ کا منہ چوم لیا تھا۔ یقین کرو کہ

پورے چالیس دن تک بیچاری کی پٹائی ہوئی تھی۔"

"کس نے پیٹا تھا؟"۔

"میرے باپ نے اور کس نے۔"

"یونان میں۔"

"نہیں! مراکش لے جا کر پیٹا تھا۔ یونان میں تو اس بیچارے ڈھمپ کو پھانسی ہو جاتی۔"

"مجھے نیند آرہی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ایک بار تو اور محبت کر جاؤ۔"

"یہ اٹلی ہے۔ اور مراکش یہاں سے دور ہے۔ شب بخیر۔" وہ زہریلے لہجے میں کہتی ہوئی چلی گئی۔"

(پوائنٹ نمبر بارہ)

عمران اور میریانا کی محبت ایک دن رنگ جماتی ہے اور میریانا محبت کرنے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے:

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" میریانا نے حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔" آفیسر بولا۔ لیکن اُس بار آواز عمران کی اصل آواز تھی۔ میرینا اچھل پڑی۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"کہیں مر نہ جانا اسی حالت میں۔" عمران نے اپنے مخصوص جلانے والے لہجے میں کہا۔

"ظالم۔" وہ یک بیک چونک کر بولی "بربر ڈھمپ! میں تم سے محبت کروں گی۔" پھر اس نے جھپٹ کر عمران کا سر تھاما اور دھڑا دھڑ اس پر اپنا سر مارنے لگی تھی۔

"ہائے مر گیا۔ ارے چھوڑو۔ مم...... مرا...... مرا......" عمران ہر چوٹ پر

بصد خلوص کراہے جا رہا تھا، بالآخر میریانا کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ پھر اگر جیمسن آگے بڑھ کر اسے سنبھال نہ لیتا تو گر ہی پڑی ہوتی۔ وہ بیہوش ہو گئی تھی اور جیمسن عمران کی شکل دیکھ کر کھی کھی کئے جا رہا تھا۔

(پوائنٹ نمبر بارہ)

ابنِ صفی کا یہ تخلیقی اضطراب ہے کہ زمانے کے شعور کے ساتھ جذب کے افق پر، تہذیبی پس منظر میں ذہانت کو پرکھتے ہیں۔ مخصوص طرزِ فکر پر یہ طنز دیکھئے:

"مجھے نام یاد نہیں رہتے اسی لئے پوچھتا بھی نہیں ہوں۔"

"میرا نام شیلا ہے...... شیلا دھنی رام۔"

"شکیلہ فضل امام ہوتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"بس آدمی کا بچہ ہونا کافی ہے۔ نام کچھ بھی ہو۔"

"آپ مجھے بہت ذہین معلوم ہوتے ہیں۔"

"سب سے بڑی حماقت وہی ہے جسے لوگ ذہانت کہتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"ذہانت نے آدمی کو نظریات دیئے ہیں۔ اور وہ نظریات کی پوٹ بن کر رہ گیا ہے...... آدمی نہیں رہا۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"نظریات ہی کی بنا پر آپ شیلا دھنی رام ہیں، شکیلہ فضل امام نہیں ہیں۔ نظریات ہی شیلا اور شکیلہ کے درمیان دیوار بن گئے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھتی ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔"

(علامہ دہشتناک)

ابنِ صفی کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ اسی لئے اکثر ناول میں سنگیت کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ نت نئی راہیں نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تحیر اور تجسس کے ساتھ طنز کی بے پناہ صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے:

"متوسط سائز کا تخت تھا۔ اس پر کیلیں گاڑ کر چھبیس تار کھینچے گئے تھے۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ سات سروں کی بجائے چھبیس سر ہوتے ہیں۔ ابھی تک موسیقی پر ظلم ہوتا رہا ہے۔ اب وہ بقیہ انیس سروں کو بھی آزادی دلائے گا۔

صفدر نے پوچھا" آخر اس کا مقصد کیا ہے؟"

"ایجاد واختراع کی ٹہنی میں پھول کھلا رہا ہوں۔" جواب ملا۔

"تو یہ بیچاری موسیقی ہی رہ گئی تھی۔"

"امیر خسرو کے بعد بڑی مشکل سے میں پیدا ہوا ہوں۔ مغفور نے مردنگ کو کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور وہ طبلوں کی جوڑی کہلائی تھی۔ میں چھبیس سروں کا ستار ایجاد کر کے اس کا نام گھپلا رکھ دوں گا۔ کیسی رہی۔"

عمران بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا۔"

(شوگر بینک)

اُردو ادب کی تاریخ پر اور اُردو شاعری کی رفتار و پرواز پر ابنِ صفی کی گہری نگاہ تھی۔ اپنے ناولوں میں طنز پیدا کرنے کے لئے کبھی غالب اور کبھی اقبال کا حوالہ دیتے ہیں اور کبھی میر سے میراجی تک فکر کی کھڑکی کھولتے ہیں:

"اب آپ حضرات فرمائیں۔" عمران ان دونوں کو گھورتا ہوا بولا۔

"کیا آپ نے شادی سے انکار کر دیا تھا؟" جیمسن نے پوچھا تھا۔

"کیا بکواس ہے۔"

"پھر بیچاری اس طرح کیوں رو رہی تھی۔"

"تم...... میری عدم موجودگی میں اسے مثنوی زہر عشق کا ترجمہ سناتے رہے ہوگے بدبخت۔"

"میر سے میراجی تک سب پڑھا دیا ہے۔"

"تمہاری سرکوبی کے لئے "گرز نریمان" تلاش کرنا پڑے گا۔"

"مجھ سے بھی تو کچھ بولو باس۔" جوزف نے دردناک لہجے میں کہا۔

"اور اسے شائد خواجہ سگ پرست کا قصہ سناتے رہے ہو۔"

"سب کچھ میں ہی کرتا رہا ہوں۔" جیمسن چڑھ کر بولا۔

"ہاں، آپ نے کیا فرمایا۔" عمران، جوزف کی طرف مڑا۔

"پردیس میں تم سے الگ رہنے سے تو یہی بہتر ہے کہ مر جاؤں۔"

"اب اسے میرابائی کے بھجن سناؤ۔" اس نے جیمسن سے کہا۔

(ایڈلاوا)

اسلام اور جمہوریت پر بہت لکھا گیا ہے۔ مختلف پہلوؤں کی معنوی تہہ داریوں سے متعلق حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن اس موضوع کو اکائی کی شکل میں ابنِ صفی نے بہتر طور پر ڈسکس کیا ہے۔ اور کیفیت کی ترجمانی کی ہے:

"جمہوریت میں دھارے کے ساتھ بہنا پڑتا ہے، جبکہ اسلام دھارے پر چڑھنے کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کے لئے صرف ایک ایماندار فرد کی حکومت کافی ہے کہ وہ ایماندار فرد اپنے احکامات نہیں۔ بلکہ قرآنی احکامات ہم سے منواتا ہے۔ لہٰذا میرے بھائی اسلام اور جمہوریت کو اجتماع ضدین سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں جمہوری نظام پنپ نہیں سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہاں جمہوریت کے علمبرداروں کو بھی ڈکٹیٹر بننا پڑا ہے اور بالآخر یہی چیز ان کے زوال کا باعث بنی کہ زبان پر تو جمہوریت کا نعرہ ہوتا تھا لیکن کرتوت ڈکٹیٹروں سے بھی بدتر — پھر جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں صرف ووٹ گنے جاتے ہیں۔ بقول اقبال "بندوں کو پرکھا نہیں جاتا۔" جو چاہے دولت کے بل بوتے پر بحیثیت امیدوار کھڑا ہو کر منتخب ہوجائے، غور کرنے کی بات ہے کہ دفتر کی کلرکی کے لئے تو آپ کو فرسٹ

کلاس گریجویٹ چاہئے۔ لیکن قوم کی باگ ڈور ''لٹھ'' قسم کے افراد کے
ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ شیخ مرغی سپلائر انگوٹھا چھاپ تو قومی اسمبلی میں
پہنچ کر قانون سازی فرمائیں اور سکنڈ کلاس گریجویٹ کو چپراسی بنانے کے
لائق بھی نہ سمجھا جائے۔ ہے سمجھ میں آنے والی بات؟ لاحول ولا قوۃ۔''

(دوسرا پتھر)

قانون کے ساتھ اخلاقیات اور اخلاقی قدروں پر ابنِ صفی کی اکثر تحریریں دل
خوش کن ضرور ہیں کہ یہ بصیرت کی روشن دلیل ہیں، اعلیٰ جمالیاتی قدروں کی آئینہ دار ہیں اور
معاشرتی تقاضے کا بھرپور اظہار ہیں۔ شرف انسانی کے حقیقی علمبردار ابنِ صفی بات سے بات
پیدا کر کے تمنائیوں کو استدلال عطا کرتے ہیں:

''میرا نام علی عمران ہے۔''
''کیا کرتے ہو۔''
بکروں کی آڑھت۔''
''میں نہیں سمجھی۔''
''مٹن کے لئے بکروں کی تجارت۔''
''اوہ۔ کیٹل فارمنگ۔''
''ہاں، یہی سمجھ لو۔''
''تو اترو۔ چلو میرے کمرے میں۔''
''میں تمہیں یہیں پانچ سو روپے دے کر بھاگ جانا چاہتا ہوں۔''
''کیوں؟ یہ کیا بات ہوئی۔''
''جتنی بھی اخلاقی قدریں یہاں باقی بچی ہیں۔ انہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔''
وہ زور سے ہنس پڑی اور پھر بولی ''تم وہاں پہنچ کر بھی شرافت کا مظاہرہ
کر سکتے ہو۔''
''تا کہ تم اپنے ملک میں جا کر کہہ سکو کہ اتنے بے ہودہ لوگ ہیں کہ خوبصورتی

سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔''
''اوہ۔ چلو بہت زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بے تکلفی
سے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولی۔
عمران سوچ رہا تھا کہ آخر وہ اس کی گردن میں کیوں جھول گئی تھی۔ وہاں اور
لوگ بھی تھے۔۔۔ بہر حال وہ اس حد تک غیر محتاط نہیں ہونا چاہتا تھا کہ اس
کے ساتھ اس کے کمرے تک چلا جاتا۔ لیکن وہ تو سر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے
پرس سے پانچ سو کے نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا ''لو یہ رکھو۔
اور ساتھ ہی میرا کارڈ بھی ہے۔ نیوزی لینڈ پہنچ کر واپس کر دینا۔''
''مجھے نہیں چاہئے۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔'' وہ بگڑ کر بولی ''اپنے سفارت
خانے سے رجوع کروں گی۔ اور میری مالی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔''
''پہلے تو تم نے میری اس پیش کش پر شکریہ ادا کیا تھا۔''
''اب تم میری توہین کر رہے ہو۔ میری پیشکش ٹھکرا رہے ہو۔''
''میں مجبور ہوں مرسیانا۔ میری ممی کو پتا چل گیا تو بہت ماریں گی۔''
''یہ کیا بکواس ہے۔'' وہ بگڑ کر بولی۔
''یقین کرو۔'' عمران گھگھیایا ''مجھے بچپن سے یہی سبق پڑھایا گیا ہے کہ کسی
عورت سے تنہائی میں نہ ملو، تم نے اس کے بارے میں پڑھا ہوگا کہ
ہمارے یہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان کم از کم ایک جوتے کا فاصلہ
ضرور ہوتا ہے۔''

(دوسرا رخ)

ابنِ صفی طنز و مزاح کو قید میں لیتے وقت تازگی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے بعض
لطیفے بھی بیان کرتے ہیں۔ یہاں ایک لطیفہ ناگزیر ہے:
''اسپین کا ایک بیوقوف طالب علم انگلستان کی سیر کو گیا، شہروں شہروں مارا
پھر رہا تھا کہ ایک ہم وطن سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے کہا شہروں میں کیا
رکھا ہے دیہاتوں میں گھومو، پھرو اور زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ طالب علم نے کہا

ٹھہروں گا کہاں؟ شہروں میں تو ہوٹل موجود ہیں۔ ہموطن نے کہا کہ بھائی،
انگریز بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اول تو تم شہروں کے آس پاس کے
دیہاتوں میں جاؤ۔ دن بھر گھومو پھرو، اور شام کو شہر آجاؤ۔ اور اگر دیہات
ہی میں رات ہوجائے تو تم کسی بھی گھر کے دروازے پر دستک دے کر
رات گذارنے کی درخواست کرسکتے ہو، وہاں رات کا کھانا بھی ملے گا اور
بستر بھی۔ پھر صبح ناشتہ کرا کے صاحب خانہ تمہیں رخصت کردے گا۔ بات
سمجھ میں آگئی۔ بیوقوف طالب علم نکل کھڑا ہوا دیہات کی طرف۔ اس نے
سوچا یہ تو بڑی اچھی تدبیر ہے۔ ایک وقت کے کھانے اور ناشتے کے پیسے ہی
بچیں گے۔ وہ دن بھر گھومتا پھرا اور دیدہ ودانستہ دیہات ہی میں رات
کردی۔ پھر ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر دستک بھی دے بیٹھا۔
ایک بوڑھے انگریز نے دروازہ کھولا۔ اور طالب علم نے رات گذارنے کی
درخواست پیش کردی۔ رات بہت سرد تھی۔ طالب علم کے دانت بج رہے
تھے۔ بوڑھے انگریز نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ کہا ''آجاؤ! بھائی آج
سردی بہت ہے۔ ہم سب بستروں میں گھس چکے تھے۔ اور ہمارے پاس
صرف دو ہی کمرے ہیں۔ ایک میں ہم بوڑھے بوڑھی سوتے ہیں اور
دوسرے میں بے بی۔ پھر وہ اسے کچن میں لے گیا۔ جو کچھ بچا کھچا تھا اس
کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔ ہمارے کمرے میں تو جگہ نہیں ہے۔ ایسا کرو کہ
بے بی کے کمرے میں سوجاؤ۔ طالب علم نے سوچا۔ بے بی رات کو اگر
جاگی اور رونے دھونے لگی تو خواہ مخواہ اس کی نیند خراب ہوگی اور اخلاقاً اٹھ
کر اسے تسلی دلاسا دیکر دوبارہ سلانا پڑے گا۔ اور اگر حوائج ضروریہ سے
فارغ کرانا پڑا تو اور مصیبت ہوگی۔ لہٰذا اس نے بڑی سعادتمندی سے کہا۔
نہیں! آپ بے بی کے آرام میں خلل اندازی نہ کریں، وہ سوگئی ہوگی۔
آپ براہ کرم مجھے ایک کمبل دے دیجئے۔ میں برآمدے ہی میں بینچ پر لیٹ

جاؤں گا۔ بوڑھے نے کہا، یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سردی بہت ہے۔
برآمدے میں اکڑ جاؤ گے۔ ایک کمبل ناکافی ہوگا۔ ہمارے احمق اکڑ کر
بولے۔ میں سیاح ہوں۔ بحر منجمد شمالی میں ایک ہی کمبل میرے لئے بہت
ہوگا۔ بہرحال اپنی ضد پر اڑ کر اس نے ایک کمبل لیا اور برآمدے میں پڑ
رہا۔ سردی سچ مچ بہت زیادہ تھی۔ رات بھر کمبل لپیٹے اکڑوں بیٹھا رہ گیا۔
دانت بجتے رہے۔ جب دیکھا کہ صبح ہورہی ہے تو ہانپتا کانپتا لیٹ گیا۔ لیکن
نیند کہاں۔ بہرحال بوڑھے نے آکر اُسے ناشتے کے لئے اٹھایا تھا۔ ناشتے
کی میز پر بوڑھی، بوڑھے کے علاوہ ایک بیحد جوان، توانا اور خوبصورت
لڑکی بھی نظر آئی۔ بوڑھے نے طالب علم سے کہا۔ ہماری بے بی سے ملو۔
اور یہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ بے بی چہک کر بولی
میرا نام میری ہے ـــــ اور تمہارا نام؟ ـــ طالب علم نے ٹھنڈی سانس لے
کر کہا۔ میرا نام! ـــ میرا نام ڈیم فل ہے۔''

(خیر اندیش)

ابنِ صفی کی تحریر میں بانکپن ہے۔ طنز و مزاح لکھتے وقت زبان کی لطافت اور جملوں
کی چستی پر خاص نگاہ رکھتے ہیں۔ اسلوب نگارش میں ندرت پیدا کرنے کے لئے نئی راہیں
تلاشتے ہیں اور حیرت انگیز طریقے سے ماحول اور معاشرہ کے دروازے پر دستک دیتے
ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں طنز و مزاح کا معیار بلند ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مطبوعات ایک نظر میں

نمبر	کتاب	صفحات	قیمت
1.	مشاہیر ادب سے مصاحبہ	408	300/-
2.	تنقید کا نیا منظر نامہ	132	100/-
3.	جوگندر پال: شخصیت	92	100/-
4.	پروفیسر محمد حسن: یادیں باتیں	64	80/-
5.	ساحر کی محبتیں: ناکام محبت: تجزیاتی مطالعہ	68	80/-
6.	دہشت گردی: منظوم	128	125/-
7.	علیم صبا نویدی: ہمہ جہت فنکار	96	300/-
8.	اختر پیامی کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ	88	80/-
9.	ژرف گوئی	66	50/-
10.	احمد وصی: شاعر اور شخصیت	160	150/-
11.	ابراہیم اشک: تجربہ کار رباعی گو	176	200/-
12.	ابراہیم اشک: افسانے اور تجزیے	160	130/-
13.	خورشید جہاں: حیات اور فن	96	80/-
14.	اسحاق ساجد: عصری شعور کا فنکار	256	200/-
15.	بہار کی بھاشائیں (ہندی)	144	150/-
16.	شریشٹھ ہندی کویتائیں (ہندی)	144	200/-
17.	پرتی نیدھی انگیکا کہانی (ہندی)	160	150/-
18.	کوسی کتھا کوسی گیت (انگیکا)	96	200/-
19.	شکار اور شکاری (انگیکا)	64	30/-
20.	فیصل کیرو جاسوسی (انگیکا)	64	30/-
21.	اصلی نقلی بریشہ	84	50/-
22.	ڈاکٹر ایم اے حق اور افسانچہ نگاری کا فن	178	200/-
23.	برطانیہ کے ہمعصر ادیب و شاعری	178	200/-
25.	رینگا	64	80/-
24.	ابن صفی کا جاسوسی سنسار	172	200/-

IBNE SAFI
KE JASOOSI NOVELON MEIN
TANZ-O-MIZAH

by

Dr. Manazir Ashiq Harganvi
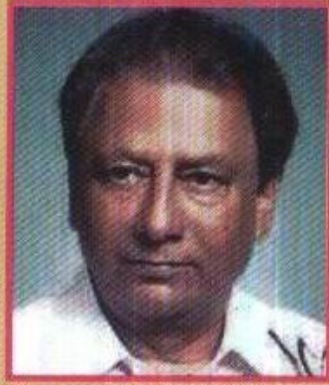
ہرزاویے سے ابنِ صفی کے جاسوسی ادب کی تفہیم

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی کتاب

ابنِ صفی کا جاسوسی سنسار

لکھنے والے: ابن صفی، احمد صفی، شکیل جمالی، حلیم بابر، مجنوں گورکھپوری، مرزا حامد بیگ، ابوالخیر کشفی، کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ (ترجمہ: نصرت ظہیر)، رؤف پاریکھ، سید تنویر حسن، محمد عارف اقبال، مجید بیدار، عقیل ہاشمی، راشد اشرف، لئیق رضوی، سید انور سعید، اسحاق اطہر رضوی، افضال احمد، محمد زاہد، اعجاز فرخ، سید فضل اللہ مکرم، سید یوسف خوندمیری، سید وجاہت شاہ نواز، رؤف خوشتر، مناظر عاشق ہرگانوی!!

سرّی ادب کے امام ابن صفی کی جاسوسی پر بے حد اہم کتاب۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-90-5073-073-7